TARIKH-E-ZABAN-E-URDU

PROF.MASOUD HUSAIN KHAN

تاریخِ زبانِ اُردو

پروفیسر مسعود حُسین خاں

ایم۔ اے ، پی۔ ایچ۔ ڈی (علیگ) ، ڈی لِٹ (پیرس)

سابق پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی

سابق پروفیسر و صدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اُردو زبان کے عہد بعہد ارتقا کی تاریخ اوراس

کی ابتداء سے متعلق لسانیاتی نظریوں کا جائزہ

ایجوکیشنل بُک ہاؤس ○ علی گڑھ

ترتیب

پہلا باب

ہند آریائی کا ارتقاء

آریوں کا وطن اور داخلۂ ہند

ہند یورپی خاندان کی زبانوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد ماہرین لسانیات اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ یہ تمام زبانیں کسی ایک قدیم زبان سے نکلی ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں ہمیں میکسؔ مولر کا یہ قول نہیں بھولنا چاہیئے کہ زبانوں کے ہند یورپی خاندان کا وجود اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ اس کے بولنے والے بھی ایک ہی نسل سے ہوں گے۔ یہ اصل زبان کیا تھی؟ اس کے بولنے والے کہاں بستے تھے، اور وہ کس طرح یورپ و ایشیا کے وسیع براعظموں میں پھیلے؟ آریوں کے متعلق یہ ایسے سوال ہیں جن پر محقیقن آج تک متفق نہ ہوسکے عِلمی تحقیق میں اختلاف کی کس درجہ گنجائش ہے اس کا اندازہ ان مختلف نظریوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہوتا ہے جو آریوں اور انکے اصل وطن کے متعلق پیش کیے گئے ہیں۔ ان کا سلسلہ ہندوستان (پنجاب و کشمیر) سے شروع ہوکر ہند وکش، تبّت، کاکیشیا، وسط ایشیا، جنوبی روس، بحیرۂ بالٹک کا ساحل، اسکنڈی نیویا، آسٹریا، ہنگری، شمالی جرمنی، پولینڈ اور بالآخر سائبیریا اور خطۂ منجمد شمالی پر ختم ہوتا ہے۔ ان سب نظریوں کی تفصیل اور پھر ان کی تردید موضوع بحث کو صرف خبط کرے گی۔ لہٰذا یہاں چند مستند نظریوں کی وضاحت پر قناعت کی جاتی ہے۔

آریوں کی قدیم کتابوں میں ان کے اصل وطن اور آمد کے سلسلے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ قدیم زمانے میں لوگوں کا خیال تھا کہ آریا تبّت سے آئے تھے۔ ہندؤں کے مذہبی عقیدہ کی رو سے تبّت کو انسان کا پہلا مسکن مانا جاتا ہے، اس لیے آریوں کو بھی اسی علاقے سے منسوب کیا گیا۔ سنسکرت کے بعض عالموں کا خیال ہے کہ آریا قبائل ہندوستان ہی کی پاک سرزمین سے اٹھے اور بعد میں ایران و یورپ میں پھیل گئے۔ اس نظریہ کو پنڈت ہری 'اودھ نے اپنی کتاب " ہندی بھاشا اور سا ہتیہ کا وکاس" میں وضاحت سے بیان کیا ہے اور اپنی اس رائے کی تائید میں سوامی دیانند، شری نرائن بھون راؤپاؤگی اور کئی یورپی عالموں کی رائیں پیش کی ہیں، لیکن ان نظریوں میں قباحت یہ ہے کہ یہ تحقیق سے زیادہ عقیدے کی پیداوار ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بقول میور سنسکرت کی جتنی قدیم کتابیں ہیں ان میں آریوں کے بدیسی ہونے کی طرف کہیں بھی اشارہ نہیں ملتا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی کہیں کھول کر نہیں لکھی گئی کہ آریا اسی سرزمیں سے اٹھے تھے۔ رِگ وید کے اندر یہاں کے دیسی قبائل اور آریوں

کی لگاتار لڑائیوں کے بارے میں جو اشارے ملتے ہیں ان سے تو صاف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آریا قبائل شمال مغربی ہندوستان کے درّوں سے لڑتے بھڑتے اور فتح کرتے ہوئے ہندوستان کے میدانوں میں داخل ہو تے ہیں۔ ان محققین کا یہ طریقۂ استدلال نہایت پُھس پُھسا ہے کہ چوں کہ ہندوستان قدیم تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے اس لیے ابتدائی زبان کی تلاش یہیں کرنی چاہیئے ۔ ایسا کہتے وقت ان کے ذہن سے وہ لسانی رشتے یکسر محو ہوجا تے ہیں جو ہمیں ایک طرف ایران اور دوسری طرف یورپ کی موجودہ زبانوں سے وابستہ کرتے ہیں ۔ اسکے علاوہ اس نظریہ کے حامیوں میں اختلاف رائے بھی ہے ۔ بعضوں کا خیال ہے کہ آریا پنجاب میں دریائے سرسوتی کے کنارے بستے تھے۔ کچھ قندھاراور تبّت کو آریوں کی جنم بھومی بتاتے ہیں ۔ پروفیسر کیتھؔ کا، جس کی دبی زبان سے گریرسن بھی تائید کرتا ہے، خیال ہے کہ آریا قبائل کا مرزدبوم ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر تھا ۔ کیتھؔ کی یہ رائے مان لینے سے وسطی ایشیا والے نظرئیے (جس کی وضاحت آگے کی جائے گی) پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ گریرسن کا خیال ہے کہ رِگ وید کے سب سے پہلے منتر آریوں کے داخلہ ہندوستان سے قبل لکھے جاچکے تھے ۔ یہ اس زبان میں لکھے گئے ہیں جو ہند ایرانی زبانوں کی ماں تھی۔

تقریباً سب جدید محققینِ لسانیات اس پر متفق ہیں کہ آریوں کے وطن کی تلاش وسطی ایشیا کے علاقوں ہی میں کرنا پڑے گی۔ ڈاکٹر چٹرجی کا خیال ہے کہ قرونِ اولیٰ کی ہند یورپی زبان و تمدن کا گہوارہ یوریشیا کے وہ وسیع میدان ہیں جن کا سلسلہ ایک طرف پولینڈ اور جرمنی سے ملتا ہے اور دوسری طرف یورال پہاڑوں کے جنوب میں وسط ایشیا کے الطائی اور تھین شان کے سلسلہ ہائے کوہ سے ۔ پروفیسر شریدر نے تعین مقام کرتے ہوئے دریائے والگا کے دہانے کو آریوں کا اصل وطن قرار دیا ہے ۔ ان کے خیال میں تاریخی دھندلکے میں آریا مغرب اور جنوب کی طرف پھیلنا شروع ہوئے ۔ جو گروہ مغرب میں داخل ہوتا ہے وہ مختلف شاخوں میں تقسیم ہو کر تمام یورپ میں پھیل جاتا ہے اورموجودہ آرمینین "یونانی " البینین، کیلٹک، جرمن ، سلوانک اور تخارین زبانوں کو جنم دیتا ہے۔ دوسرا گروہ جو جنوب مشرق کی سمت اختیار کرتا ہے بحیرۂ کیسپین کے شمال سے ہوتا ہوا موجودہ بدخشاں اور کوہ کند کے علاقے میں پہونچتا ہے جہاں وہ پھر دو شاخوں میں بٹ جاتا ہے ۔ ایک شاخ مشرقی ایران میں داخل ہوتی ہے اور پھر دریائے کابل کی وادی کے راستے سے ہندوستان میں ۔

"کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" میں پروفیسر (GILES) نے جغرافیائی اور تاریخی وجوہ کی بنا پرآریوں کی نقل و حرکت کے اس نظریہ کو رد کیا ہے ۔ وہ آریوں کے پھیلنے کا مرکز آسٹریا ہنگری بتاتے ہیں اور اس طرح ان کے خیال میں سب سے زیادہ فطری راستہ درہ ٔ دانیال اور ایشیائے کوچک میں سے ہوگا ۔ تاریخ میں بعد کو نقل مکان کی جتنی مثالیں ملتی ہیں ان میں یہی راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ بحیرہ ٔ کیسپین کے شمال مشرق سے آریوں کا گذرنا اس لئے نا ممکن قرار دیا گیا ہے کہ یہ نشیبی علاقہ ہے جس کا بیشتر حصہ عہدِ عتیق میں تہِ آب تھا ۔ اس وقت

بحیرہ کیسپین اتنے وسیع رقبے میں پھیلا ہوا تھا کہ اس کا سلسلہ جھیل ارال سے ملتا تھا ۔ اسی طرح جنوبی روس سے کاکیشیا کی جانب بھی نقل و حرکت نا ممکن تھی ۔ پہاڑوں کے اس دشوارگذار سلسلہ کو یونانی قدرتی فصیل سمجھتے تھے ۔ آج بھی یہ سلسلہ صرف درّہ دانیال سے عبور کیا جاسکتا ہے ۔

وسطی ایشیا" والے نظریہ کی تائید ان ریکارڈوں سے بھی ہوتی ہے جو سن ۱۹۰۶ء میں ایشیائے کوچک میں دریافت ہوئے ہیں اور جن کا تعلق ۱۵۰۰ قبل مسیح سے ہے ۔ ان ریکارڈوں میں بعض دیوی دیوتاؤں کے نام مثلاً (اندرا، ارونا ، متّیرا وغیرہ) ملتے ہیں ۔ جنھیں مٹّنی کے حکمراں پوجتے تھے ۔ یہ نام سنسکرت کی مقدس کتابوں میں جوں کے توں پائے جاتے ہیں ۔ بالخصوص اعداد تو سنسکرت اعداد سے اتنے ملتے جلتے ہیں کہ یہ امر مسلم ہوجاتا ہے کہ آریا کاکیشیا کے راستے سے ایشیائے کوچک اور مشرق کی طرف بڑھے ہوں گے۔ اس طرح اوستا کی فطری اور غیر مصنوعی زبان کے دونوں کناروں پر ہمیں خالص مصنوعی زبان کے نمونے ملتے ہیں، مشرق میں سنسکرت اور مغرب میں ایشیائے کوچک کے نئے دریافت شدہ ریکارڈوں کی زبان ۔ یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ آریا ان دونوں مقاموں پر بے گانوں کی طرح رہے اور اپنی نسل اور زبان کو الگ تھلگ رکھا، جیسا کہ ان کا عام دستور تھا ۔ اس کے برعکس ایران خاص میں ان کی زبان فطری طور پر بدل کر اس مصنوعی رجحان کو گنوادیتی ہے ۔

ان آریوں کو تاریخی روشنی میں سب سے پہلے ہم شمال مغربی ایران میں (۲۰۰۰ ق ۔ م) دیکھتے ہیں ۔ ہندوستان میں آریوں کے داخلہ کی تاریخ ۱۵۰۰ ق ۔ م مقرر کی جاسکتی ہے ۔ یہ امر یقینی ہے کہ ہند یورپی زبان بولنے والے آریا اپنے داخلۂ ہند سے قبل عرصے تک مشرقی ایران میں قیام کرچکے تھے، جہاں ان کی زبان ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی ۲۰۰۰ ق۔م تک " ہندایرانی " منزل پر پہنچ جاتی ہے " ہند یورپی" زبان کی یہ "ہند ایرانی " شکل ہی ان تمام زبانوں کی ماں کہی جاسکتی ہے جو بعد کو ایران میں پھیلیں اور جسے آریا بولتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے ۔ ہندوستان کے زرخیز میدانوں میں آریوں کا داخلہ کسی منظّم سیاسی تحریک کی شکل میں نہیں تھا یہ عمل کئی صدیوں تک جاری رہا اور اس میں جہاں گیری سے زیادہ جہاں پیمائی کا جذبہ کارفرما تھا۔

ہندوستان میں آریوں کا سابقہ دراویدی اور آسٹرک قوموں سے پڑا ۔ دراویدیوں سے ان کا مقابلہ مغربی اور شمالی مغربی ہندوستان میں ہوا ۔ آسٹرک زیادہ تر مشرقی اور وسط ہند کے علاقوں میں آباد تھے ۔ ان قوموں کو زیر کرنے میں انھیں کافی جدوجہد کرنی پڑی ۔ اس جدوجہد کی جھلک رِگ وید کے بعض قصّوں میں پائی جاتی ہے ۔ چنانچہ موجودہ ہندی تمدّن خالص آریائی تمدّن نہیں کہا جاسکتا ۔ فاتح اور مفتوح دونوں آخر میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ یہی شکل یہاں بھی پیدا ہوئی ۔ جس طرح بعض مورخوں کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ ہندوستان میں آریائی تمدّن مذہب کی آڑ میں پھیلا لیکن آریا قوم کے افراد بہت کم تعداد میں ہندوستان کو اپنا گھر بنا سکے، ۔ اسی طرح یہ کہنا بھی تاریخی غلطی ہوگی کہ آریائی سماج دراویدی تمدّن کو نگل گیا تھا ۔ نئے انکشافات سے یہ بات

پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ہندوستان میں نوواردآریوں کا ایک ایسے تمدّن سے سابقہ پڑا تھا جو کئی لحاظ سے ان صحرانوردوں کے تمدّن پر فوقیت رکھتا تھا ۔ چنانچہ موجودہ ہندی تمدّن کے بعض بنیادی عناصر اسی قدیم ہندوستانی تمدّن کی یادگار ہیں۔ آریوں نے دراویدی مذہب کے بہت سے عناصر قبول کرلئے ۔ بعض دیوی دیوتاؤں کے تصّورات اور دیومالا ، کچھ کھانے پینے کی چیزیں (پان سپاری) اور لباس (دھوتی اور ساری) خالص درادیدی عناصر ہیں ۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے ، محققین نے دراویدی زبانوں کے بعض عناصرکی نشان دہی کی ہے۔ ان زبانوں کا آریائی زبان کی قواعد اور صوتیات پر کافی اثر پڑا اور آریائی زبان نے " ہند ایرانی" منزل سے گذر کر " ہند آریائی " شکل اختیار کرلی۔ شمالی ہند میں اب دراویدی زبانو ں کا نام و نشان نہیں ملتا ہے ۔ تحقیق کا یہ حصّہ بالکل تاریکی میں ہے اس کے بجز کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ قدیم پرکرتوں کی پیدائش دیس کی انھیں بولیوں کی گود میں ہوئی ہوگی۔

قدیم آریائی تہذیب کی سب سے بڑی دین " براھمی" رسم الخط ہے، جس کا ارتقا ہندوستان میں ہوا اور جو ہندوستان کی تمام زبانوں کی لکھاوٹوں ۔ (الاّ اردو اور کشمیری) کا ماخذ ہے اور جسے آریوں نے شروع سے اپنی زبانوں کے لئے استعمال کیا ہے۔

ہند آریائی کا عہدِ قدیم

(۱۵۰۰ ق م ۔ تا ۵۰۰ ق م)

آریائی زبان کا پہلا مستند نقش ہمیں رِگ وید (۱۰۰۰ ق م سے قبل)کی شکل میں ملتا ہے ۔ اس وقت " ہند یورپی " زبان " ہند ایرانی" منزل سے گزر کر خالص " ہند آریائی " شکل اختیار کرچکی تھی ۔ چنانچہ مشرقی ایران سے لے کر پنجاب تک اس لسانی ارتقاء کے تسلسل کی نشان دہی کی جاسکتی ہے ۔ رِگ وید کے مختلف حصوں کی تصنیف مختلف زبانوں اور مختلف مقاموں پر ہوئی ہے ۔ کسی میں قندھار کے راجہ دیوداس کا ذکر ہے تو کسی میں سندھ کے کنارے بسنے والے راجہ سُورداس کا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکے کچھ منتر قندھارمیں لکھے گئے کچھ دریائے سندھ کے کنارےاور کچھ جمنا کی وادی میں۔ رِگ وید کے ابتدائی حصے تو تقریباً ڈھائی ہزار برس قبل مسیح کی تصنیف ہیں ۔ لیکن آخری باب آٹھویں صدی قبل مسیح میں تصنیف ہوئے ۔ آریائی تہذیب کے اُس وقت دو بڑے مرکز تھے ۔ مغرب میں گندھار اور مشرق میں براہمہ ورتا (پٹیالہ اور کرنال کے اضلا ع) اس میں شک نہیں کہ آریا ابھی دریائے سندھ تک ہی پہنچ پائے تھے کہ ان کی زبان نے ادبی شکل اختیار کرلی تھی ۔ لیکن رِگ دید کے بیشتر منتراسی غیر مصنوعی اور سادہ زبان میں ہیں جو اس وقت آریوں کے گھرانوں میں بولی جاتی تھی ۔ اگر بقول میکڈانلڈرِگ وید کی زبان کو ادبی مان بھی لیا جائے اس کا مطلب یہ ہرگز نہ ہوگا کہ وہ اس زمانہ کی بولیوں کی

نشان دہی نہیں کرتی۔ ادبی زبان چالو زبان سے مختلف ضرور ہوتی ہے لیکن بالکل مختلف نہیں۔ ویدک زبان کا سلسلہ دوسرے ویدوں سے بالخصوص یجروید اور براہمنہ کے نثری پاروں تک سے ملتا ہے رِگ وید کی زبان شمال مغربی ہندوستان کی آریابولی پر مبنی تھی ۔ آریوں کے مختلف قبائل کی بولیوں میں خفیف اختلافات تھے لیکن رِگ وید کی زبان کا معیار سب تسلیم کرتے تھے ۔

مغربی ہندوستان کی اس آریا بولی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں (ر) اور (ل) دونوں آوازوں کے لئے صرف (ر) کی آواز مستعمل تھی ۔ یہ خصوصیت قدیم فارسی میں بھی پائی جاتی ہے ۔ اس میں نفَسی دھ ۔ بھ ۔گھ قسم کی آوازوں کو" ہ " میں تبدیل کرنے کا رجحان بھی ملتا ہے۔ بعد میں چل کر یہی " ر" اور"ل "کی آوازیں مشرق اور مغربی ہندوستان کی قدیم وجدی بولیوں میں امتیاز کرنے کی مخصوص علامتیں بن جاتی ہیں ۔ مثلاً مغربی ہندوستان کی پراکرت میں " ل "کی آواز نہیں ملتی ۔ پالی اور سنسکرت میں مذکورہ بالا دونوں ۔۔۔۔آوازیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جوں جوں ہم مشرق (بہار اور بنگال) کی طرف جاتے ہیں ، وہاں کی پراکرتوں میں صرف " ل " کی آواز ملتی ہے۔ " ر" غائب ہوجاتی ہے۔

دریائے سندھ سے آریا جوں جوں مشرق کی طرف بڑھے ان کی زبان پر صوبجاتی اور دیسی بولیوں (کول، دراویدی وغیرہ) کا بھی اثر پڑا جو وید کے مختلف بابوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوجاتا ہے ۔ یہ اثر صرف تلفظ تک محدود نہیں بلکہ دیسی الفاظ کی آمیزش بھی ہونے لگی تھی۔ دراویدی اور کول زبانوں کے ایسے الفاظ کی ڈاکٹرچٹرجی نے ایک طویل فہرست دی ہے ۔ یہاں مثالاً صرف چند درج کئے جاتے ہیں : کپی (بندر) کلا (آرٹ) کالا (وقت) کنڈا (کنڈ) نیلا (نیلا) پُشپا (پھول) پوجانا (پوجا) پھلا (پھل)بِلا (بل) بیجا (بیج) میورا (مور) راتری (رات)روپا (روپ) ۔ برہمنہ میں جاکر ایسے الفاظ بکثرت ملتے ہیں ۔ رفتہ رفتہ ملک کے دورو دراز حصوں میں پھیلنے اور غیر آریا اقوام سے ربط و ضبط بڑھنے کی وجہ سے آریا زبان کی مرکزی حیثیت ختم ہونے لگی ۔ صرفی و نحوی اور صوتی اختلافات پیدا ہونے لگے ۔ ایک ہی لفظ کی مختلف شکلیں بولی جانے لگیں ۔ بعض جگہ الفاظ کو اجنبی ماحول کی صوتیات سے متاثر ہو کر توڑ مروڑدیا جاتا۔ حروف کا تلفظ بھی مختلف طریقہ سے کیا جانے لگا۔ مشرقی ہندوستان کے صوبوں میں یہ تبدیلیاں تیزی سے نمایاں ہونے لگیں۔ ۱۰۰۰ ق م تا ٦۰۰۰ ق م آریا شمالی ہند میں پنجاب سے لے کر بنگال تک پھیل چکے تھے اوں ان کی زبان کی مرکزی حیثیت ختم ہوچکی تھی ۔ اس عہد کی گروہ بندی حسب ذیل طریقہ پر کی جاسکتی ہے ۔

(۱) اُدیچیہ : شمال مغربی ہندوستان کی زبان

(۲) مدھیہ دیشہ : (مدھیہ دیش، انبالہ سے الہ آباد) کی زبان

(۳) پراچیہ: مشرقی ہندوستان کی زبان

یہ آریا سلطنتوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ اُدیچیہ (شمال مغربی ہندوستان کی زبان) کو اس لحاظ سے فوقیت حاصل تھی کہ وہ آریوں کی قدیم معیاری زبان سے قریب تر تھی ۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں یہی زبان زیادہ صحیح اور کھری سمجھی جاتی تھی اور لوگ آریوں کی معیاری زبان کی سنداس علاقے سے لیتے تھے ۔ پراچیہ زبان کا رواج آریوں کے ان قبائل میں تھا جو موجودہ اودھ ، مشرقی یو۔ پی اور مغربی بہار کے بعض حصّوں میں آباد تھے ۔ یہاں کی زبان ...دیسی بولیوں سے مل کر اپنا آریائی لہجہ کسی حد تک کھو چکی تھی ۔ مغربی ہندوستان کے آریا ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور " اَسوروں" (بھوت پریت) کی نسل سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کی زبان کو "براہمنہ" میں ، اشدھ ، کہا گیا ہے۔ اس میں (ر) کی آواز (ل) میں تبدیل ہوجاتی تھی (موجودہ بہاری: راجہ = لاجا ۔ کھیر = کھیل) مدھیہ دیش کی زبان کے تفصیلی حالات نہیں ملتے یہاں کی زبان نہ تو اس قدر معیاری سمجھی جاتی تھی جتنی کہ شمال مغربی ہندوستان کی زبان اور نہ اس قدر پست جیسی کہ پراچیہ (پورب) کی بولی ۔ رفتہ رفتہ جوں جوں آریائی تہذیب کا مرکز پنجابَ سے ہٹ کر دوآبۂ گنگ و جمن ہوتا گیا۔ مدھیہ دیش کی زبان کو ممتاز حیثیت دی جانے لگی ۔

اسی زمانے میں زبان کو نئے سرے سے منظّم کرنے کی کوشش کی گئی ۔ صوبائی اور مقامی تعصّبات سے الگ ہٹ کر صرف ایسے الفاظ کو ٹکسالی مانا گیا جو سب جگہ رائج ہوں۔ اسی طرح زبان صوبائی ہونے کے بجائے " راشٹری" (ملکی) بن گئی ۔ سب لوگ ادب میں ایک خاص قسم کی ٹکسالی زبان کا استعمال کرنے لگے اور یہ زبان بن سنور کر سنسکرت (شُدھ) ہوگئی ۔ جو درجہ آج کل ہندوستانی کو حاصل ہے یا عہدِ پراکرت میں مہاراشٹری کو حاصل ہوا وہی درجہ اس زمانہ میں سنسکرت کو حاصل تھا ۔ ملک کے جن جن حصّوں میں آریا پھیل گئے تھے وہاں کے مذہبی، علمی اور ادبی طبقوں میں یہ سمجھی اور بولی جاتی تھی ۔ جو لوگ (بالخصوص پورب کے جہاں پرکرات سب سے پہلے سر اٹھاتی ہے) بول نہ سکتے تھے وہ بھی سمجھ ضرور لیتے تھے ۔ ہندوستانی بولیوں کی کثرت میں یہ وحدت کا کام دیتی تھی ۔ ہندوستان کے قدیم ناٹکوں میں جن کا تعلق پہلے سنہ عیسوی سے ہے سنسکرت بولنے والے کرداروں کا تعلق عام طور سے براہمنوں یا اعلٰی طبقے کے لوگوں سے ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنسکرت کا رواج خاص خاص طبقوں کافی عرصہ بعد تک رہا ۔ اس لئے یہ عام خیال لسانیات کی رو سے بالکل غلط ہے کہ سنسکرت کبھی بھی بول چال کی زبان نہیں رہی ہے ۔ وہ تو صرف برہمنوں کی گھڑی، یگوں میں بولی جانے والی زبان تھی ۔ پانِنی نے (۳۰۰ ق م) میں زندہ زبان کی قواعد لکھی تھی ۔ قواعد داں کبھی بھی کسی نئی زبان کی تخلیق نہیں کرسکتے ۔ البتہ وہ کڑے اصول بنا کر اس کی ترقی کو روک سکتے ہیں ۔ اس کی بہترین مثال ہمیں اس زمانہ کے ان ماہر لسانیات کی کوششوں میں ملتی ہے ۔ جنھوں نے ایک بین الاقوامی زبان " اَیس پیرنیٹو" بنانے کے لئے برسوں سر مغزنی کی اور بالآخر متفقہ طور پر اپنی ناکامی کا اعلان کردیا ۔ اس لئے تاریخِ زبان میں اس قسم کے

مفروضات کا بے معنیٰ ہونا مسلّم ہے ۔ البتہ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ گریرسن جیسے بڑے محقّق نے سنسکرت کے متعلق اسی قسم کا اظہار خیال کیا ہے ۔ اونچے اور ادبی طبقے میں بول چال کی زبان ہونے کا وافر ثبوت ہمیں سنسکرت کے قدیم قواعد نویس یاسکا (مصنف نروکتا) کے یہاں ملتا ہے جو اس زبان کو "بھاشا" (بولی جانے والی زبان) کے نام سے یاد کرتا ہے اور اس میں اور ویدوں کی زبان میں امتیاز کرتا ہے ۔ اس کے بعد پانٹنی (۳۰۰ ق م) نے بھی اس زبان کو بھاشا کہا ہے ۔ وہ بھی ویدک سنسکرت کو مردہ اور ادبی سنسکرت کو زندہ زبان جانتا ہے ۔ کات یا ین اور پَتَن جَلی جو پانٹنی کے بعد آتے ہیں اس فرق کو برقرار رکھتے ہیں ۔ ادبی سنسکرت ۔ (بقول گریسن کلا سیکل سنسکرت) کی سب سے پہلی جھلک ہمیں آخری براہمنوں ، اُنپشدوں اور " سوتروں " میں ملتی ہے ۔ اس زمانے میں دراصل لفظ سنسکرت صفت کے طور پر استعمال ہوتا تھا ۔ " سنسکرت واکیم " ٹھیک اس زبان کو کہتے تھے جسے اردو میں شستہ زبان کہا جاتا ہے رفتہ رفتہ لفظ سنسکرت ایک خاص زبان کے سلسلے میں بولا جانے لگا ۔شستہ اور وسیع ہونے کی وجہ سے ادبی تصنیفات اسی میں ہونے لگیں ۔ سنسکرت زبان کی اس وقت کی شکل کو استحکام بخشنے کی خاطر پاٹنی نے اس کے اصول بنائے ہیں لیکن پاٹنی اور دوسرے وقواعد نوسیوں کی پابندیوں کے باوجود سنسکرت زبان میں کیا باعتبار الفاظ اور کیا با عتبار صرف و نحو کافی عرصہ تک ارتقاء ہوتا رہا ہے اور بحیثیت علمی و تصنیفی زبان کے اس کارواج جدید آریائی زبانوں کی پیدائش کے بہت بعد تک رہا۔

رفتہ رفتہ سنسکرت کا رواج کم ہونے لگا۔ اس کے کئی سبب تھے ۔ چونکہ اس نے مذہب اور ادب کو اپنے آغوش میں جگہ دی اس لئے یہ عوام کی بولیوں سے دور ہوتی گئی ۔ نیز ہندوستاں جیسے وسیع ملک میں ہر زبان کا مقدّر یہ ہے کہ وہ تھوڑے عرصہ میں خواص کی زبان بن جائے ۔ لیکن اس کے زوال کا سب سے بڑا سبب وہ مذہبی انقلاب تھا جو مہاویر سوامی (متوفی ۴٦٨ ق ۔ م) اور مہاتما گوتم بدھ (متوفی ۴٨٦ ق ۔ م) کی کوششوں سے ہندوستان میں نمودار ہوا۔ دونوں نے اپنے اپنے دھرموں کا پرچار اپنے یہاں کی مقامی بولیوں میں کیا۔ عوام نے اس کا استقبال کیا ۔ اس طرح مذہب کا سہارا لے کر صوبائی بولیاں چمک اٹھیں اور سنسکرت سے ٹکّرلینے لگیں ۔ ردِّ عمل کے طور پر ویدک مذہب کے علمبردار اپنی زبان کی حفاظت اور زیادہ سختی سے کرنے لگے ۔ سنسکرت رفتہ رفتہ ایک فرقہ کی زبان بن کر رہ گئی ۔ سنسکرت کے زوال کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ ویدوں کی زبان تھوڑی بہت منظّم ہونے کے باوجود اتنی ٹھس اور جامد نہیں تھی جتنی کہ ادبی سنسکرت کے زوال سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ ویدوں کی زبان تھوڑی بہت منظّم ہونے کے باوجود اتنی ٹھس اور جامد نہیں تھی جتنی کہ ادبی سنسکرت اپنی اہلیت کی وجہ سے اس نے "دیوبانی "کا رتبہ تو پایا لیکن یہی " امرپن " اس کے لئے بار بن گیا ۔ ادھر اس کی دوسری بہن جورانی نہ بن کر عوام کی گود میں پلی جس نے آریوں کے علاوہ غیر آریوں کو بھی سمیٹا

مروجہ زبان کی ماں بن بیٹھی ۔ استعارہ میں یہی بات یوں کہی جائے گی کہ زبان کا جو دھارا آریوں کے وقت سے بہنا شروع ہوتا ہے اس کی ایک شاخ جھیل کی شکل اختیار کرلیتی ہے، حسین لیکن محدود، جسے ہم سنسکرت کہتے ہیں۔ جس کے اردگرد اس کے گرامر کے سنگین ساحل پھیلے ہوئے ہیں۔ اس دھارے کی دوسری شاخ مختلف روپ بدلتی ہوئی اب تک بہہ رہی ہے کبھی گدلی، کبھی تابناک ، لیکن ہر لحظہ پھیلتی ہوئی۔ ہندوستان کی موجودہ زبانوں کا تعلق براہ راست دھارے کی اسی شاخ سے ہے ۔ مختصر یہ کہ آریوں کی " ابتدائی زبان" ہی سے ویدک سنسکرت اور ادبی سنسکرت پیدا ہوئیں۔ اور غیر آریوں کے میل کا سہارا پاکر دوسری صوبائی بولیاں بھی پھوٹیں ۔ سنسکرت نے صرف چُنے ہوئے شائستہ اور بلیغ الفاظ سے اپنا خزانہ بھرا۔ لیکن دوسری نے ویدک زبان کے فطری رجحان کو اپنایا ۔ یہی ان کے پراکرت (فطری) کہلانے کا سبب ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ویدک زبان کی بعض خصوصیتیں جو ان میں ملتی ہیں ، ادبی یا کلا سیکی سنسکرت میں نہیں ملتیں۔ اس طرح ویدک سنسکرت اور پراکرتوں میں ادبی سنسکرت کی بہ نسبت زیادہ قریب کا رشتہ دکھائی دیتا ہے۔

مذکورہ بالاسطور میں یہ بات واضح ہوگئی کہ شروع ہی سے عوام کی زبان ایک مخلوط زبان تھی ۔ ایک ایسی زبان تھی جس میں آریوں کی ابتدائی زبان اور دیسی بولیوں دونوں کا میل تھا ۔ بعض لوگوں نے اسی کو "پہلی پراکرت "کہا ہے اور ویدک سنسکرت اور ادبی سنسکرت دونوں کی ماں مانا ہے۔ ہم اُسے " ابتدائی زبان" کے نام سے یاد کریں گے اور پہلی پراکرت صرف اس زبان کو کہیں گے جس کا ادبی روپ پالی ہے ۔ ویدک سنسکرت اسی " ابتدائی زبان "کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی اور اس کا پرچار کافی عرصہ تک برہمنوں کے گھروں اور ان کی مذہبی کتابوں میں رہا ۔ یہ بہت بعد کی بات ہے جب یہ ترش ترشا کر برہمنوں کے ہاتھوں ادبی سنسکرت کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ پیدائش کے بعد بھی عوام کی بولی کا ڈھرّا الگ رہا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں سنسکرت کے قدیم نمونے مل جاتے ہیں اور عوام کی ان بولیوں کے نام تک نہیں ملتے ۔ پراکرت کے سبب سے قدیم نمونے بدھ اور جینیوں کی مذہبی کتابوں یا پھراشوک (۲۵۰ ق ۔ م)کی لاٹوں پر کنبدہ کئے ہوئے ملتے ہیں۔ اسی کوہم پہلی پراکرت ماننے پر مجبور ہیں ۔ پراکرت کی اسی ادبی شکل کو پالی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ لیکن پراکرت کا یہ نام اس وقت پڑا جب اس نے ادبی زبان کی حیثیت اختیار کرلی تھی اور اس پرشوریسنی پراکرت (شَورسین ، متھرا اور اس کے اردگرد کا علاقہ)کا پورا پورا اثر پڑچکا تھا ۔ لفظ پالی سنسکرت کے " پنکتی " سے نکلتا ہے ۔ (اسی سے اردد کو پانتی ، پتّی اور پٹی ہے) پنڈت ہری اودھ کی تحقیق کے مطابق پالی بُدھ دھرم شاستر کی سطر کو کہتے ہیں۔ اس کے نام سے ثابت ہے کہ بدھ مت کی ابتدائی کتابیں اسی زبان میں لکھی گئی ہوں گی ۔ اس پالی کو قدیم مالگدھی بھی کہتے ہیں ۔ لیکن یہ مالگدھی (مگدھ = جنوبی بہار)بعد کی نئی مالگدھی سے مختلف تھی۔ اس وقت یہی بول چال کی زبان تھی ۔ بُدھ لوگ اسی کو سب سے پہلی زبان مانتے ہیں اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ انسانوں کی سب سے قدیم زبان یہی ہے

اور اس سے دیگر زبانیں ، سنسکرت وغیرہ نکلی ہیں ۔ گوتم بُدھ نے اسی بولی میں اپنے دھرم کی تبلیغ کی تھی ۔ مدھیہ دیش کے عالموں اوراُدیچ (پنجاب وغیرہ) کے بولنے والوں کے نزدیک یہ لچر اور پوچ زبان تھی جس میں ان کی زبان کے الفاظ بگاڑدئیے جاتے تھے ۔ گوتم بُدھ اس زبان کی اہمیت پر کس قدرزور دیتے تھے ، اس پر روشنی اس واقعہ سے پڑتی ہے جو ان سے منسوب ہے ۔ یمیل اور اُتے کیل ناموں کے دو برہمن بھائی مہاتما کے پاس آتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ اے بھگوان ! مختلف ذات پات کے لوگ آپ کے بولوں کو دُہراکرنا پاک کررہے ہیں اس لئے ہمیں حکم دیجئے انھیں چھندوں (ویدک سنسکرت) میں لکھ دیں تاکہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جاسکے ۔ مہاتما انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔ " اے بھکشؤ ! بُدھ کے بولوں کو سنسکرت میں ہرگزنہ لکھنا، ججو ایسا کرے گا ۔ میری توہین کرے گا ۔ میری باتوں کو اپنی ہی بھاشامیں سمجھنے کی کوشش کرو" " اپنی بھاشا" سے مراد یہی مالگدھی زبان ہے جس کا ذکراوپر ہوچکا ہے ۔

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے پہلی پراکرت یا پالیؔ کے نمونے یاتو بُدھوں کی مذہبی کتابوں میں ملتے ہیں یا پھراشوک کی لاٹوں پر جو جنوب میں گنجم سے لے کر شمال مغربی سرحدی صوبے کے علا قے میں شہباز گڑھی تک ملتی ہیں ۔ یہ تحریریں تو کھرو شڑی میں ہیں اور باقی سب براہمی میں ۔ ان کی موشگافی کے بعد محققین اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ اشوک کے زمانہ میں زیادہ سے زیادہ چار اور کم سے کم دو زبانیں را ئج تھیں ۔ ایک مشرقی دوسری مغربی ۔ مغربی زبان پر جیسا کہ شہباز گڑھی کی لاٹ سے ثابت ہے ۔ سنسکرت کا اثر گہرا تھا وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے مشرقی زبانوں کی بہ نسبت قدیم آریائی زبان سے زیادہ قریب تھی ، گریرسن نے بھی زبان کے اس اختلاف کو مشرقی مغربی پراکرت کے نام سے یاد کیا ہے ۔ دونوں کی اپنی اپنی لسانی خصوصیات ہیں جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہیں ۔ مغربی پراکرت کی نمایاں شکل شورسینی پراکرت تھی ۔ مشرقی پراکرت ماگدھی کہلا تی تھی ۔ یہ مگدھ دیس (جنوبی بہار) میں بولی جاتی تھی ۔ اس زمانہ تک کسی ایسی پراکرت کا پتہ نہیں ملتا ۔ جسے دکھنی پراکرت کہا جاسکے ۔

ہندآریائی کا عہدِ وسطی

(۵۰۰ ق۔م تا سنہ ۶۰۰)

اس عہد میں بھی ہند آریائی زبان کے ارتقا کی دو نمایاں شکلیں نظر آتی ہیں ایک طرف تو عوام کی بولیاں بُدھ اور جَین مَتوں کا سہارا لے کر تیزی کے ساتھ ادبی پراکرتوں کی شکلیں اختیار کررہی تھیں ۔ دوسری طرف سنسکرت جو باعتبار صوتیات اور صوریات ابھی تک آریائی زبانوں سے رشتہ جوڑے ہوئے تھی اور جس کی

نحواور فرہنگ سے روح عصر بھی جھلکتی تھی ، علمی اور ادبی طبقوں میں دھاک جمارہی تھی ۔ بُدھ اور جین متوں کے پیغمبربھی سرزمین ہند سے اس کی جڑیں نہ اکھاڑسکے ۔ بلکہ جوں جوں پراکرتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور زبان کا دھارا اپنے سر چشمہ سے دور ہوتا گیا ، سنسکرت کی اہمیت کا لوگوں کا اور زیادہ اندازہ ہوتا گیا۔ اگر ایک طرف یہ عہدِ وسطیٰ کی لسانی خصوصیات کی آئینہ بردار تھی تو دوسری طرف قدامت پرستی کے جذبہ کو بھی تسکین دیتی تھی ۔

ویدک سنسکرت کے بہت سے لفظ اب متروک ہو گئے تھے ۔ جیسا کہ مذکور ہوچکا ہے پا نٹنی کے سخت قید وبند کے باوجود سنسکرت کا ارتقاءنہ رُک سکا ۔ قطع نظر فرہنگ کے نحوی قاعدوں میں بھی خفیف تبدیلیاں ہوتی رہیں ۔

سنسکرت کے پہلو بہ پہلو پراکرتوں کا بھی ارتقا ہوتا رہا ۔ موجود ہ تحقیقات کی بنا پر پہلی اور دوسری پراکرت میں خطِ فاصل قائم کرنا دشوار ہے ۔ دوسری پراکرت کے ابتدائی حالات کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا البتہ پالی ہی کے اندر ہمیں اس پراکرت کی شکل دکھائی دیتی ہے پچھلے باب میں بتایا جاچکا ہے کہ تلفظ کا بگاڑ اور الفاظ کا توڑ مروڑ سب سے پہلے ہندوستان کی مشرقی بولیوں میں نمودارہوتا ہے ۔ ان بولیوں میں حروف صحیح (مصمتوں) کامیلان جذب پذیری کی طرف پایا جاتا تھا اور دندانی آوازیں (مثلاً "ر" کا " ل " میں بدل جانا) مخی آوازوں میں بدل جاتی تھیں۔ یہ خصوصیت آ ج بھی بنگال اور بہار کی بولیوں میں پائی جاتی ہے ۔ مشرقی ہندوستان میں ۶۰۰ ء ق م کے لگ بھگ دوسری پراکرت کا عہد شرو ع ہوجاتا ہے ۔ مغربی یو۔ پی (دو آبہ) اور پنجاب میں یہ لسانی تبدیلیاں آہستہ آہستہ بعد کو رونما ہوتی ہیں ۔ آ ج بھی ان علاقوں کی بولیوں میں انفی آوازوں اور مشدّد لفظوں کی کثرت ملتی ہے جو عہدِ وسطیٰ کی پراکرت کی نمایاں خصوصیتیں تھیں ۔ اس کے برعکس مشرق کی بولیوں میں حروف علت (مصوتوں) کا استعمال بکثرت پایا جاتا ہے ۔

عہدِ وسطیٰ کی پراکرتوں میں جذب پذیری اور دندانی آوازوں کو مخی آوازوں میں تبدیل کردینے کا مذکورہ بالا رجحان ضروری نہیں کہ دراویدی اور آسٹرک زبانوں کے اثرات کا نتیجہ ہو ۔ بہت ممکن ہے کہ یہ نسل اور زبان کے ارتقا کا فطری عمل ہو۔ چوں کہ ابھی تک دراویدی اور آسٹرک کے متعلق پورا علم نہیں ہے اس لئے تحقیق کا یہ پہلو تا حال تاریکی میں ہے ۔

اس عہد کی ادبی پراکرت کی پانچ واضح شکلیں نظر آتی ہیں :

(۱) **مہاراشٹری** : ادبی حیثیت سے اس زمانہ میں مہاراشٹری پراکرت کو سب سے زیادہ عروج حاصل تھا ۔ عہد پراکرت کے قواعد نویسوں نے اس کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے بلکہ ا سے نمونہ مانا ہے ۔ دوسری پراکرتوں کا سرسری طور پر ذکر کردینے کے بعد ہمیشہ یہ لکھ دیا ہے کہ باقی سب باتوں میں یہ مہاراشٹری سے ملتی جلتی ہیں ۔

اس عہد کا بیشتر شعری ادب اسی پراکرت میں ملتا ہے۔ موسیقی میں بھی اس کا استعمال ہوتا تھا اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ حروف علت(مصوتوں) کی کثرت کی وجہ سے اس میں لوچ زیادہ تھا ۔ آج بھی مہاراشٹر کا سنگیت اُتمّ مانا جاتا ہے اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لفظ مہاراشٹر سے اکثر ملک ہندوستان مرادلی جانے لگی۔

ڈاکٹر چٹرجی نے ڈاکٹر من موہن گھوش کی ایک تصنیف کے حوالے سے مہاراشٹری پراکرت کی علیٰحدہ حیثیت کو ماننے سے انکار کردیا ہے ۔ ان کے خیال میں مہاراشٹری کی نسبت ملک مہاراشٹر سے نہیں بلکہ وہ شورسینی پراکرت کی ایک شستہ اور ترقی یافتہ شکل تھی (مفصل بحث کے لئے دیکھئے چٹرجی کی انڈوایرین اور ہند ی صفحہ ۸۴۔)

(۲) شورسینی : اس کا مرکز شوَرسین دیس (دوآبہ کا وسطی حصہ : متھرا) تھا۔ سنسکرت کے بعد اعلیٰ طبقہ میں اگر کسی پراکرت کا رواج تھا تو وہ یہی تھی جس پر سنسکرت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے ۔ سنسکرت کے ناٹکوں میں بھی اس کی چھٹ پٹی جھلک ملتی ہے ۔ دراصل متھرا (دوآبہ گنگ وجمن) ہی وہ علاقہ ہے جہاں سنسکرت اور شورسینی پراکرت دونوں پروان چڑھتی ہیں۔ اس لیے دونوں میں نہایت قریب کا رشتہ نظر آتا ہے۔سن ـــــہ ا ء سے پہلے ہی اس نے مسلّم ادبی زبان کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔

(۳) ماگدھی : مگدھ دیس (جنوبی بہار)کی پراکرت تھی۔ چونکہ یہ آریائی تمدّن کے مراکز سے کافی دور جاپڑی تھی اس لئے ایک غیر مہذب اور ناشستہ زبان سمجھی جاتی تھی ۔ ماگدھی پراکرت اس وقت آریائی زبان کے پھیلاؤ کی مشرق میں آخری حد تھی ۔ بعض مصنفوں نے اس پراکرت کو پالی سے خلط ملط کردیا ہے ۔ حالاں کہ یہ امر تحقیق شدہ ہے کہ پالی کا یہ نام (ماگدھی) سب سے پہلے سیلون کے بدھوں میں پڑا ، جو ہندوستانی زبانوں کے باریک اختلافات سے ناواقف تھے۔

(۴) شورسینی اور ماگدھی پراکرتوں کے درمیان علا قے (بہار سے الہ آباد تک)میں اَردْھ (آدھی) ماگدھی پراکرت بولی جاتی تھی۔ بعد کو جس علا قے کو دلّی والے " پورب" کے نام سے پکارتے رہے ہیں ، مغربی ہندوستان کے رہنے والے اس وقت پراچیہ کہا کرتے تھے ، پراچیہ کے تحت ماگدھی اور اَردْھ ماگدھی دونوں آجاتی تھیں۔ ان دونوں میں اردھ ماگدھی کو فروغ رہا گوتم بدھ اور مہابیر جین دونوں نے اسی کی قدیم شکل میں اپنے اپنے دھرم کا پرچار کیا۔ اس کا رواج اس زمانہ کے شاہی خاندانوں تک میں رہا۔ شاہی زبان ہونے کی وجہ سے یہ دوسری پراکرتوں پر اثرانداز بھی ہوئی ۔ تاریخ سے اس بات کا وافر ثبوت ملتا ہے کہ دوآبہ کے رہنے والوں کو اس وقت مشرق کی اس پراکرت کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی یہ اس وقت کی معیاری زبان تھی ،گِرنار، شہباز گڑھی اور مان سیہرا کی لاٹوں تک میں اس کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں لیکن خود اَردْھ ماگدھی پراکرت مارکنڈے کی مطابق شورسینی اور ماگدھی کے میل سے بنی ہے ۔ آج کل مشرقی ہندی (پوربی) کی بناوٹ پر غور کرنے سے بھی یہی

معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف یہ موجودہ بہاری اور دوسری طرف مغربی ہندی (دو آبہ کی زبان) کی آمیزش سے بنی ہوگی۔

پشاچی پراکرت ، وہ پراکرت جو پنجاب اور کشمیر کے علاقے میں بولی جاتی تھی ۔ (پِشاچ = کّچا گوشت کھانےوالے) اتنے دھندلکے میں تھی کہ عوام میں یہ بھوت پریت کی زبان کے نام سے مشہور تھی ۔ عہد پراکرت کے قدیم قواعد نویس وروچی (تقریباً ۱۰۰ ق ۔ م) نے جو چار پراکرتیں گنائی ہیں ۔ اس میں پشاچی کو بھی جگہ دی ہے اس کی فہرستِ حسبِ ذیل ہے۔

(۱) مہاراشٹری (۲) پشاچی (۳) ماگدھی (۴) شورشینی ۔ہیم چندر نے بھی جس کازمانہ بارھویں صدی کے اواخرکا ہے پشاچی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس میں ادب بھی ملتا ہے۔ راج شیکھر (دسویں صدی کے آغاز) نے اپنی "کاویہ می مانسا" میں ایک پرانا اشلوک نقل کیا ہے جس سے اس زمانہ کی بولیوں کے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہیں ۔ اس کے خیال میں جو شاعر مدھیہ دیش میں رہتا ہے وہ لاٹ(گجرات) ٹک (ٹانک، جنوبی پنجاب) بھادانک (راجپوتانہ کا کوئی حصہ؟) ان سب علاقوں کی زبانوں پر قدرت رکھتا ہے ۔ گریرسن نے بھی رام شرما کی تحریروں کے اس حصے پر کافی زور دیا ہے ۔ جس میں پشاچی کا ذکر ہے ۔ رام شرما سے اتفاق کرتے ہوئے گریسن پشاچی زبان کی دو شکلیں قرار دیتا ہے ایک خالص اور دوسری مخلوط پہلی سات اور دوسری کی چار شکلیں مانی گئی ہیں ۔ کشنوں کے عہد (پہلے سنہ سے چار سنہء تک) میں شمالی مغربی ہندوستان کی اس پراکرت کو فروغ حاصل ہوا ۔ اس زمانہ میں شاہی سرپرستی کے تحت " گندھار" کی بولی ادبی اور معیاری زبان کی حیثیت سے اس علاقہ میں رائج ہوگئی اور ٹکسلا کا ددارالعلوم اس وقت علم و ادب کا مرکز بن گیا تھا ، جہاں تحصیل علم کی خاطر ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے طالب علم آتے تھے۔

موجودہ پشا چی زبانیں خالص ہندوستانی نہیں کہی جاسکتیں ان کے تلفظ کے اصول (مثلاً لہندا میں "ر" کا تلفظ) ہند آریائی زبانوں کے اصولوں سے مختلف ہیں ۔ ان میں کہیں کہیں ایرانی زبانوں کی خصوصیات بھی جھلک آتی ہیں وہ نہ تو خالص ہندوستانی معلوم ہوتی ہیں اور نہ خالص ایرانی ۔ ژنداوستا ۔ کی زبان سے شاید بہت پہلے ان کا تعلق ہند آریائی زبانوں سے منقطع ہوگیا تھا ۔ بھنڈا رکر کے خیال کے مطابق یہ پشاچی پراکرت شاید آریا قوم کی اس شاخ سے تعلق رکھتی ہے جو ہم قوموں کے ساتھ عرصہ تک رہی لیکن ہندوستان میں ان کے بعد داخل ہوئی ، یایہ بھی ممکن ہے کہ دوسری آریائی قوموں کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئی ہو لیکن علیٰحدہ ایک طرف پہاڑی علاقے میں بس گئی ہو دونوں صورتوں میں پشاچی پراکرت آریائی زبان ہونے کے باوجود ہندوستان کی آریائی زبانوں سے کافی حد تک مختلف ہوجاتی ہے۔

یہ باب ختم کرنے سے پہلے ایک بات کی طرف اشارہ کردیناضروری ہے ۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوچکا ہے ۔

ہر پراکرت کا نام اس دیس کے کسی نہ کسی علاقہ سے منسوب کیا گیا ہے لیکن اس کے یہ معنٰی ہرگز نہیں کہ وہ پراکرت اس علاقہ کی بولیوں کی نمائندگی کرتی ہے یہ درحقیقت ایک بڑا لسانی مغالطہ تھا جسے جدید تحقیق نے رد کردیا ہے ۔ مثلاً پالی جسے ماگدھی بھاشا کے نام سے بھی پکارا گیا ہے مگدھ دیس (جنوبی بہار) سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی ۔ یہ بہار کی قدیم بولی کی بہ نسبت مدھیہ دیش کی قدیم بولی سے زیادہ قریب دکھائی دیتی ہے جس کے تانے بانے شورسینی پراکرت سے گتھے نظر آتے ہیں ۔ یہی حال مہاراشٹری پراکرت کا تھا جو بقول چٹرجی شورسینی پراکرت کی ایک جدید اور ترقی یافتہ شکل تھی۔

ہند آریائی کا عہدِ جدید

(سن ۶۰۰ء تا سن ۱۰۰۰ء)

لسانیات کا یہ ایک اٹل اصول ہے کہ بول چال کی زبان جتنی تیزی سے بدلتی ہے ادب کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ چنانچہ جب پراکرتوں نے ادبی شکل اختیار کرنا شروع کی تو وہ عوام کی ڈگر سے پرے جا پڑیں اور عوام کی زبان کا دھارا آگے بڑھتا رہا ۔ اسی بول چال کی زبانوں کو اس عہد کے قواعد نوسیوں نے " اَپ بھرنش " (بگڑی زبان) کہا ہے ۔ تاریخ لسانیات کی یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ لوگ ہمیشہ زبان کے سنورنے کو اس کے بگڑنے سے تعبیر کرتے چلے آئے ہیں ۔ بھامہ اور دنڈی (ساتویں صدی عیسوی) کے تذکروں اور ولبھی کے راجہ دھرسین کے کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ چھٹی صدی میں اَپ بھرنش تحریر میں استعمال ہونے لگی تھی۔ کالی داس کی " وِکرَ موْرشی " میں اسکے اشعار ملتے ہیں ۔ بلکہ بعضوں کے نزدیک تو دوسری یا تیسری عیسویں سے ہی اس کی جھلکیاں پراکرت کے ادب میں ملتی ہیں ۔ مثلاً اس زمانہ کی شمال مغربی پراکرت کا عام رجحان یہ ہے کہ (و) (او) میں تبدیل ہوجاتا ہے لیکن اَپ بھرنش کو اتنا قدیم نہیں مانا جاسکتا ۔ کیوں کہ پراکرتوں کے نمونوں میں اَپ بھرنش کی عام خصوصیات مثلاً سنسکرت اور (م) (:) کے بجائے (اُ)یا (م) کے بجائے (واں) وغیرہ نہیں ملتیں ۔ غرضکہ اس کے بیج ممکن ہے ، دوسری صدی عیسوی کی پراکرت تک مل جائیں ، لیکن یہ پروان چھٹی صدی عیسوی میں جاکرچڑھتی ہے ۔ ڈاکٹر سدھیشورورما بھی اس سے متفق ہیں ۔ " اپ بھرنش (لفظی معنٰی " افتاد") پراکرت کا مابعد کا ارتقاہیں ۔ ان بولیوں کا آغاز چھٹی صدی عیسوی سے ہوا " ہندوتان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کی تاریخ سنہ ۱۰۰۰ء مقرر کی گئی ہے ۔ لیکن اَپ بھرنش میں تصنیفات کا سلسلہ چھٹی صدی سے لے کر چودھویں بلکہ پندرھویں صدی عیسوی تک ملتا ہے " پراکرت پنگل " (پندرھویں چدی عیسوی) کی تصنیف اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اَپ بھرنش(بلکہ پراکرت) کی قدیم روایات کے جکڑ بند سے عرصہ تک ہمارے شعر و

ادب کو چھٹکارا نہیں ملا تھا ۔ اس زمانہ میں علمیت کا سارا دارومدار اس بات پر تھا کہ ان روایات کو کس حد تک نبھایا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی فتوحات نے اس وقت ہر چیز کو تہ وبالانہ کردیا ہوتا تو شمالی ہند میں نئی آریائی زبانوں کا ظہور عرصہ تک کے لیے ملتوی ہوجاتا۔

شرو ع شرو ع میں لفظ " اَپْ بھرنش "کسی خاص زبان کے لئے استعمال نہ ہوتا تھا ۔ پڑ ھے لکھے لوگ اَن پڑھوں کی زبان کو اَپْ بھرنش " یا " اَپ بھاشا " کہا کرتے تھے ۔ تپن جلی نے اپنی " مہا بھاش" میں اس لفظ کا ذکر ان معنوں میں کیا ہے ۔ اس کے خیال میں اس زبان میں بگڑے ہوئے الفاظ کی تعداد خالص سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ سنسکرت کے ایک ایک لفظ کے کئی کئی اَپْ بھرنش ملتے ہیں ۔ یہاں اَپْ بھرنش سے مراد تپن جلی وہ الفاظ لیتا ہے جو سنسکرت کے کسی ایک لفظ کے معنوں میں مختلف مقامات پر بولے جا تے تھے ۔ آریا لوگ اپنی زبان کے معاملہ میں بڑے کٹّر واقع ہوئے تھے ۔ سنسکرت میں " ملّچھَ " اَپْ بھرنش لفظ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے گھن اور نفرت کا مفہوم بعد کو پیدا ہوا ۔ ایک خاص زبان کے معنوں میں سب سے پہلے ہیمؔ چندر نے لفظ اَپْ بھرنش استعمال کیا ہے۔

اَپْ بھرنش کو ملک کی زندہ زبان پاکر بالآخر تعلیم یافتہ طبقہ بھی اسکی طرف متوجہ ہوا ۔ پورب کی زبانوں تک نے اس کے اثر کو قبول کیا ۔ لیکن گجرات، راجپوتانہ اور دو آبہ میں بولی جانے والی بولیوں پر اس کی چھاپ گہری پڑی ۔ چنانچہ سـنہ ۸۰۰ ء سے سـنہ ۱۰۰۰ ء تک دو آبہ کی شورسینی اَپ بھرنش ایک طرح سے سارے شمالی ہندوستان کی ادبی زبان بن گئی تھی ۔ اس کا سب سے بڑا سبب راجپوتوں کا سیاسی اقتدار تھا ۔ جن کی راجدھانی اس وقت گنگا کی ترائی میں شہر قنوّج تھا ۔ اس کے علاوہ گجرات کے جینیوں نے بھی اس کو ترقی دی ۔ پراکرت کے بڑے عالم مارکنڈے نے اَپ بھرنش کی تین قسمیں بتائی ہیں۔

(۱) ناگر اَپْ بھرنش : جو گجراتی اور راجستھانی کی قدیم بولیوں کی ادبی شکل تھی لیکن جس پرشورسینی کا اس قدر اثر پڑا تھا کہ وہ اس کی بیٹی معلوم ہوتی تھی ۔ اس اَپ بھرنش کو فوقیت اس لئے حاصل تھی کہ یہ علمی طبقہ میں مقبول تھی ناگری اسی کی رعایت سے پڑا ہے خود اس کا " ناگر " نام گجرات کے ناگر برہمنوں کے نام پر پڑا۔

(۲) براچڈاَپْ بھرنش :۔ یہ سندھ میں رائج تھی موجودہ سندھی اسی سے نکلی ہے۔

(۳) اُپ ناگر :۔ یہ ناگر براچڈ کے میل سے بنی تھی اور اس کا رواج مغربی راجپوتانہ اور جنوبی پنجاب میں تھا۔

(۴) پورب میں اشوک کے بعد وہاں کی زبان نے بالکل ترقی نہیں کی ۔ کم از کم ماگدھی پر تاریخی سایہ آہی جاتا ہے یہ ایک نیچ زبان سمجھی جانے لگی تھی ، سنسکرت کے ناٹکوں میں نیچ ذات کے کرداروں سے یہی بلوائی جاتی تھی ۔ اَرْدھ ماگدھی اور ماگدھی دونوں کے علاقوں میں شورسینی ہی ادبی زبان کی حیثیت سے رائج

تھی ۔ اس زمانہ میں پورب کے شاعر اسی میں شاعری کرتے تھے اور یہ سلسلہ عرصہ تک قائم رہا ۔ دسویں سے تیرھویں صدی تک کی پرانی بنگلہ شاعری میں شورسینی کا اثر صاف جھلکتا ہے ، میتھلا (بہار) کے مشہور شاعر ودّیاپتی (تیرھویں صدی عیسوی) نے میتھلی کے ساتھ ساتھ " اوہٹ " میں بھی شاعری کی ہے ۔ اسی طرح شورسینی اَپْ بھرنش اس وقت شمالی ہند کی " لنگوافر نیکا " کی حیثیت رکھتی تھی ، جو گجرات و مغربی پنجاب سے لے کر بنگال تک رائج تھی ۔ اس کے ادب کی نشاندہی سنہ ۸۰۰ء سے سنہ ۱۳۰۰ء تک کی جاسکتی ہے جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے ، گجرات اور راجپوتا نے کے جینیوں نے اس میں ادب کا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے ۔ بنگال میں بدھ مت کے مبلّغوں ....(سدّھوں) نے مذہبی امور کے لئے اسی کو اپنایا ۔ پنجاب میں "گورکھ پنتھیوں " نے اپنے پُراسرار مذہب کی تبلیغ کے لئے اسی کو آلۂ کار بنایا ۔ مذہب اور ادبیات سے قطع نظر دو آبہ اور اس کے آس پاس کے علاقے میں یہ گھریلو زبان کی حیثیت سے رائج تھی جس میں عوام کی مذہبی اور عشقیہ واردات کے زبردست نقش ملتے ہیں ۔ڈاکٹر کیٹ کا یہ خیال صحیح نہیں کہ اَپْ بھرنش آبھیر(موجودہ اہیر) اور گوجر قبائل کی زبان تھی ۔ جیسا کہ پرانی بنگلہ کی شاعری اور ودّیاپتی کی تصنیفات سے صاف ظاہر ہے ۔

رفتہ رفتہ یہ اَپْ بھرنش بھی ادبی بن کر رہ گئی ۔ اپنے آخری دور (سنہ ۱۰۰۰ء) میں یہ بہت کچھ موجودہ زبانوں کی قدیم شکلوں سے ملتی جلتی ہے ۔ موجودہ ہندوستانی زبان اور شوریسنی اَپْ بھرنش کی درمیانی منزل کو بعض اوقات " اوہٹ " بھی کہا گیا ، ودّیا پتی کی شاعری اسی میں ہے ۔ اس میں عام طور سے مروّجہ بولیوں کی آمیزش پائی جاتی ہے ۔ اسی" اوہٹ " میں جب پراکرتی روایات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے تو ا سے پنگل کہتے ہیں ۔ راجپوتانہ کے بھاٹ شاعر اپنی ڈِنگل (قدیم راجستھانی) کے ساتھ ساتھ اس میں بھی شاعری کرتے تھے ۔ یہ صحیح صحیح بتانا ذرا مشکل ہے کہ اَپْ بھرنش کس سنہ میں ختم ہوتی ہے اور موجودہ آریائی زبانوں کا کب آغاز ہوتا ہے ۔ لسانی تبدیلیاں نہایت چپکے اور چھُپ کے رونما ہوتی ہیں ۔ اندازاً کہا جاسکتا ہے کہ جدید آریا زبانوں کا طلوع ۱۰۰۰ء سے ہوتا ہے ۔ یہ بہت بڑے سیاسی الٹ پھیر کا زمانہ تھا ۔ مسلمان آناً فاناً شمالی ہند کو زیر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے ۔ ان کے جلومیں ایک نیا تمدّن اور ایک نئی زبان آرہی تھی ۔ 'انھوں نے سنسکرت کے فسوں کو توڑ کر بہت جلد ہندوستان کی نئی زبانوں کو اپنے بل پر کھڑا ہونا سکھایا ۔ ہندوؤں ازمنہ وسطیٰ کی مذہبی تحریکوں سے ان کو تقویت پہونچی ۔ چنانچہ بہت جلد ان زبانوں میں مذہبی گیتوں اور کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا ۔

اس عہد میں سنسکرت کا دخل فصل بھی کم ہوگیا تھا ۔ لیکن مذہبی حلقوں میں اب بھی اس کا رواج تھا ۔ البیرونی (سنہ ۱۰۲۵ء) نے اپنے ہندوستان کے دورانِ قیام میں اس بات کا اندازہ کرلیا تھا کہ عوام کی زبان اور اس کا شعر و ادب سنسکرت کی سخت بندشوں سے آزاد ہوکر آگے بڑھ رہا ہے ۔ لیکن اسے عوام کی ان بولیوں سے نہ تو دلچسپی تھی اور نہ واقفیت ۔ قدیم علوم کی تحصیل کی وجہ سے اس کا تعلق زیادہ تر سنسکرت جاننے والے پنڈتوں

سے رہا۔ اسی وجہ سے اس نے سنسکرت کی اہمیت پر غیر معمولی زور دیا ہے ۔

غرض کہ ہندوستان کی جدید زبانوں کی پیدائش پراکرتوں سے نہیں بلکہ اَپْ بھرنشوں سے ہوتی ہے ان کا سلسلہ حسبِ ذیل اَپْ بھرنشوں سے ملایا جاسکتا ہے۔

(۱) شَورسینی اَپْ بھرَنش

(۱) کھڑی بولی یا ہندوستانی (موجودہ اُردو، ہندی)

(۲) راجستھانی

(۳) پنجابی (مشرقی)

(۴) گجراتی اور پہاڑی بولیاں۔

گجراتی اور راجستھانی کا تعلق شَورسینی کی اس شکل سے ہے جسے ناگر اَپْ بھرنش بھی کہا جاتا ہے۔

(۲) ماگدھی اَپْ بھرَنش

اس علاقہ بہت وسیع تھا اس لئے مختلف مقامات پر اس کے مختلف نام پڑگئے ۔ بنگال میں پراچیہ، گوڑ اور ڈھکئی کہلائی جس سے موجودہ بنگالی اور آسامی نکلیں ۔اڑیسہ میں اس کا نام " اَت کلی" پڑا جس سے موجودہ زبان اڑیا نے جنم لیا۔

بہار کی تمام بولیاں اس کے تحت آجاتی ہیں۔ بہار کی بولی کا نام " مگہی " ہے جو ماگدھی لفظ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

(۳) اَرْدھ ماگدھی اَپْ بھرَنش

پوربی ہندی (اودھی وغیرہ)

(۴) مہاراشٹری اَپْ بھرَنش

اس کا خاص مرکز موجودہ برار تھا۔ سنسکرت میں اسی صوبہ کو مہاراشٹر کے نام سے پکارا گیا ہے۔

۵ شمالی مغربی ہندوستان کی پراکرتیں اوراَپْ بھرنش ابھی تک تاریخی دھندلکے میں ہیں ۔ان نقشہ کاحسبِ ذیل ہوسکتا ہے ۔

(الف)براچڈ اَپْ بھرنش۔ سندھی۔

(ب) کیکئی اَپْ بھرنش : ۔ لہندا دیس کا قدیم نام کیکئی تھا یہ براچڈ سے ملتی جلتی اَپْ بھرنش ہوگی ۔ اسی لیے سندھی اور لہندا(مغربی پنجاب) میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

مشرقی پنجابی کا تعلق بھی اسی کیکئی اَپ بھرنش سے تھا۔ لیکن بعد کو اس پر شوَرسینی کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ گجراتی اور راجستھانی کی طرح گریسن نے اس کا سلسلہ بھی شورسینی اَپْ بھرنش سے ملادیا۔ جدید پنجابی زبان کی ساخت اور پرداخت میں شورسینی اَپْ بھرنش اور لہندا کی قدیم زبان کا کیا حصّہ ہے اس ذکر تفصیل سے آگے آئے گا۔

اَپْ بھرنش کا باب ختم کرنے سے پہلے اس طرف اشارہ کردینا ضروری ہے کہ جدید زبانوں کے رشتے ناتے قدیم پراکرتوں اور اَپْ بھرنشوں سے اتنی آسانی سے نہیں ملائے جاسکتے جتنا کہ بعض محقیقن نے سمجھ رکھا ہے۔ مثلاً بہاری، بنگالی، اُڑیا اور آسامی زبانوں کا سلسلہ ماگدھی اَپْ بھرنش سے ملایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب اگر صرف اس قدر ہے کہ ان تمام زبانوں میں ماگدھی اپ بھرنش کے بعض اصول مشترک ہیں تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر اس سیمرادیہ لی جائے کہ سنہ ۶۰۰ ء سے سنہ ۱۰۰۰ء تک بہار، بنگال، آسام، اور اڑیسہ میں صرف ایک ہی زبان بولی جاتی تھی جس کی ادبی شکل ماگدھی اَپْ بھرنش ہے تو یہ نہ صرف غلط بلکہ لسانی اعتبار سے ناممکن ہوگا۔ اتنے بڑے علاقے میں اگر ایک زبان بولنے والے پھیل جائیں تب بھی علاقائی اختلافات پیدا ہوجانا لازمی امر ہے۔ یہی استدلال شوَرسینی اور اس سے متعلق زبانوں کے سلسلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ شورسینی پراکرت یا اَپْ بھرنش سے موجودہ پنجابی، راجستھانی اور مغربی ہندی کی بولیاں نکلی ہوں، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ شورسینی اَپْ بھرنش، شوَر سین دیس (متھرا) کی قدیم بولی کی بنیاد بنی ہوئی ادبی زبان رہی ہوگی، اسی کے ساتھ ساتھ آس پاس کے۔۔ علاقوں میں اس وقت جدید زبانوں کی قدیم شکلیں رائج ہوں گی جن کے نمونے آج نہیں ملتے۔ آج بھی کچھ ایسی ہی حالت نظر آتی ہے۔ پنجاب سے لے کر بنگال تک ادبی حیثیت سے صرف ایک زبان استعمال میں لائی جاتی ہے۔ اس زبان کی بنیاد اس بولی پر ہے جو دلّی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی ہے۔ یعنی کھڑی بولی۔ اس کے ساتھ ساتھ برج بھاشا، اودھی، بندیلی، بگھیلی، پنجابی اور بہاری بولیاں آج بھی اپنے اپنے علاقوں کی زندہ زبانیں ہیں۔ لیکن چوں کہ ان میں سے کسی کو بھی ادبی مرتبہ حاصل نہیں اس لئے آج سے دو سوسال بعد کے محقق کو ان زبانوں کے علاقوں میں بھی صرف ادبی زبان (اُردو یا ہندی) کے نمونے مل سکیں گے۔ کیا اس وقت یہ طریق استدلال صحیح ہوگا کہ چونکہ کھڑی بولی اتنے وسیع علاقے میں بولی جاتی تھی اس وقت یہ طریق استدلال صحیح ہوگا کہ چونکہ کھڑی بولی اتنے وسیع علاقے میں بولی جاتی تھی اس لئے اس علاقے کی تمام بولیاں ضرور ہے کہ اسی سے نکلی ہوں گی۔ یہاں یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ادبی کھڑی بولی کو آج جتنا عروج حاصل ہے ہندوستان کی کسی زبان کو کسی زمانہ میں حاصل نہ تھا۔ اس کے باوجود کھڑی بولی ابھی تک (قطع نظر شہر اور قصبات کے) مقامی بولیوں کی جگہ نہیں لے سکی ہے، دراصل زبان کا جو نقشہ آج ہے وہی آج سے آٹھ سو برس پہلے تھا اور وہی آج سے اٹھارہ سو برس پہلے۔ (پراکرتوں کا طلوع) بھی تھا۔ یعنی صوبائی اور مقامی بولیوں کی

کثرت کے درمیان ایک ادبی زبان کی وحدت ! یہ لسانی نقشہ سیاسی الٹ پھیر کے ساتھ بدلتا رہا ۔ آریوں کے داخلۂ ہندوستان (۱۵۰۰ ق م) سے لے کر مسلمانوں کے داخلۂ ہندوستان (ســـنہ ۱۰۰۰) تک کی تاریخ مختلف سلطنتوں کے بننے اور بگڑنے کی ایک طویل داستان ہے ۔ جس علا قے کے لوگ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوجاتے اس علا قے کی بولی آناً فاناً شاہی سرپرستی میں ہندوستان کی معیاری زبان کی حیثیت سے پھیل جاتی تھی ۔ اشوک کا عہد اَرْدھ ماگدھی پراکرت کے عروج کا زمانہ تھا جس نے مغربی ہندوستان کی تمام پراکرتوں کو متاثر کیا ۔ ہرش وَردھن اور راجپوتوں کی فتوحات کے ذریعہ دو آبہ کی زبان سراٹھاتی ہے اور پہلے شَور سینی اَپْ بھرنش اور بعد کو برج بھاشا کی شکل میں سارے شمالی ہندوستان کی مانی ہوئی ادبی زبان بن جاتی ہے ۔ آج بھی اسی دو آبہ کی ایک بولی یعنی کھڑی بولی ، ہندوستان کی لنگوا فرنیکا بنی ہوئی ہے جو یقیناً اس تاریخی حادثہ کا طفیل ہے کہ مسلمانو ں نے دہلی کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔

○○○

دوسرا باب

ہندوستان کی جَدید آریائی زبانیں

جدید آریائی زبانوں کی گروہ بندی

سنہ ۱۸۸۰ میں سب سے پہلے مستشرق ہرنلے نے اِس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہندوستان کی موجودہ زبانوں کی ساخت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ہندوستان میں آریا دو مختلف گروہوں میں داخل ہوئے ہونگے۔ آریوں کا دوسرا گروہ پہلے گروہ کے کافی عرصہ بعد آیا ہوگا۔ لیکن وہ ان سے ملتی جلتی آریائی زبانیں بولتا ہوگا۔ گریرسن ہرنلے کے اس نظریہ کو جوں کا توں تسلیم نہیں کرتا۔ تاریخی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے وہ صرف ان گروہوں کے اختلاف زبان پر زور دینا کافی سمجھتا ہے لیکن ہرنلے کے خیال میں آریوں کا دوسرا دَل پنجاب کے میدانوں کو پار کرتا ہوا گنگا کی وادی تک جا پہونچتا ہے اور پہلے آریادَل کو مشرق اور مغرب (پیچھے کس طرح؟) کی طرف ڈھکیل دیتا ہے۔ گریرسنؔ اس تاریخی مفروضہ سے اختلاف کرتے ہوئے دوسرے پہلو کے امکانات کو لسانی دلیلوں سے اجاگر کرتا ہے۔ اس کے خیال میں نووارد آریا اپنا راستہ بند دیکھ کر بہت ممکن ہے پہلے آئے ہوئے آریوں کے چاروں طرف نیم دائرہ کی شکل میں پھیل گئے ہوں۔ پنجاب میں ان کا مقابلہ پرانے آریوں سے ہوا ہوگا۔ جہاں سے شکست کھا کر انھیں اپنا رُخ سندھ کی وادی اور وہاں سے وسطی ہندوستان مہاراشٹر، بہار اور اڑیسہ کی طرف کرنا پڑا ہوگا۔ اس طرح نئے آریا پرانوں کے اردگرد گھیرا سا ڈال دیتے ہیں۔ ہرنلے اور گریرسن دونوں کے بیانات سے یکساں نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں آریوں کا ایک گروہ اندرونی بن جاتا ہے اور دوسرا ان کے تین طرف نیم دائرہ کی شکل میں بیرونی۔ اگر ہرنلے صحیح ہے تو نووارد آریا اندرونی۔ کہلائیں گے اور اگر گریرسن کی بات تسلیم کی جائے تو پرانے آریا۔

ہرنلے کے اس نظریئے یا گریرسن کی اندرونی و بیرونی تقسیم کا دھندلاسا روائتی ثبوت ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں مل جاتا ہے۔ بالخصوص مہابھارت کے اندر پنچالوں اور کوروں کی لڑائی درحقیقت دو آبہ کے آریا اور نوارد آریوں کے درمیان سیاسی اقتدار کے لئے زور آمائی تھی۔ پنچالوں کے حمائتی پانڈے تھے جو ایک کوہستانی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، پنچال، کوروں کی بہ نسبت یہاں کے زیادہ پرانے باسی تھے، اس لئے ان کے رنگ سیاہی مائل بتائے گئے ہیں۔ مہابھارت میں ان آریوں کو جو دریائے سندھ کے کنارے پر بستے تھے "ملچھ" کے نام سے

یاد کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ دو آبہ والے انھیں غیر آریا سمجھتے تھے۔

اس کے بعد " مدھیہ پردیش" (مغربی یوپی اور مشرقی پنجاب) کے آریوں کا عروج ہوتا ہے وہ اپنے علاقہ سے نکل کر برابر مختلف سمتوں میں پھیلتے رہے چنانچہ سنسکرتی عہد کے جغرافیہ میں جس علاقہ کا نام بار بار آیا ہے اور جسے خالص آریوں کی جنم بھومی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ وہ یہی " مدھیہ دیش" ہے اس کی حد بندی شمال میں ہمالیہ، جنوب میں وندھیا چل اور مغرب میں سرہند سے لے کر مشرق میں الہ آباد تک مقرر کی گئی ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی روایات کے مطابق اس کے مشرقی سے سے مغربی سرے تک سرسوتی نام کا مقدس دریا بہتا ہے جو انسانی آنکھ سے اوجھل ہے۔

گریرسن کی تقسیم زبان کے مطابق شمالی ہندوستان کی جدید آریائی زبانیں دوگروہوں میں بٹ جاتی ہیں ایک اندرونی اور دوسرا بیرونی۔ اندورنی زبانیں ٹھیک اس علاقہ میں بولی جاتی ہیں جس کا ذکر اوپر مدھیہ دیش کے نام سے کیا جاچکا ہے۔ بیرونی گروہ کی زبانیں نیم دائرے کی شکل میں مغربی پنجاب سے شروع ہوکر سندھ، مہاراشٹر، وسطی ہندوستان، اڑیسہ، بہار، بنگال اور آسام تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ کی کڑی صرف گجرات میں ٹوٹتی ہے۔ گجرات پر گریرسن کے خیال میں متھرا والوں کا سیاسی اقتدار کافی عرصہ تک رہا۔ لہٰذا وہاں کی زبان مدھیہ دیش کی زبان سے اس درجہ متاثر ہوئی ہے کہ گریرسن موجودہ گجراتی کو اندورونی زبانوں کی صف میں جگہ دیتا ہے۔

گریرسن کی تقسیمِ زبان کا نقشہ

(۱) بیرونی زبانیں

(الف) شمال مغربی شاخ

۱۔ لہندا (مغربی پنجابی)۔ ۲۔ سندھی

(ب) جنوبی شاخ

۱۔ مراٹھی

(ج) مشرقی شاخ

۱۔ آسامی۔ ۲۔ بنگالی ۔۳۔ اُڑیا۔ ۴۔ بہاری بولیاں

(۲)وسطی زبانیں

۲۔ پوربی ہندی

(۳) اندرونی زبانین

۱۔ مغربی ۲۔ پنجابی (مشرقی) ۳۔ گجراتی ۴۔ راجستھانی ۵۔ بھیلی ٦۔ خاندیشی

(۴) پہاڑی زبانیں

۱۔ مشرقی پہاڑی یا نیپالی ۲۔ درمیانی پہاڑی ۳۔ مغربی پہاڑی

اندرونی اور بیرونی زبانوں کی یہ گرہ بندی گریرسن نے ہرنلے کے برعکس زبانوں کی ساخت اور ان کے کینڈوں پر غور کرنے کے بعد کی ہے۔ اس کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) دونوں گروہوں کی زبانوں میں تلفظ کا بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً اندرونی شاخ کی تمام زبانوں میں (س) کا تلفظ صحیح ہوتا ہے اسکے برعکس بیرونی زبانوں میں یہ عام طور سے (ش) میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ قدیم ایرانی میں بھی (س) (ہ) میں تبدیل ہوجاتا تھا۔ مثلاً سنسکرت (سپت)= فارسی (ہفت) (س) (سندھ) = ف (ہند) وغیرہ۔ تلفظ کی یہ خصوصیت ہندوستان کی شمال مغربی بولیوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ مغربی پنجابی اور سندھی میں (کوس) کا (کوہ) بن جاتا ہے۔ ادھر بنگالی اور مراٹھی میں (س) ہمیشہ (ش) میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ بلکہ مشرقی بنگالی اور آسامی میں تو یہ (چ) اور (س) کی درمیانی آواز بن جاتا ہے۔

(۲) اندرونی اور بیرونی زبانوں کے اسماء کی شکلیں بھی مختلف ہوتی ہیں، تقریباً تمام اندرونی زبانوں میں ایسے حروف سے کام لیا جاتا ہے جو الفاظ کے ساتھ جوڑدیئے جاتے ہیں۔ مثلاً کا۔ کی۔ کے۔ کو۔ سے، نے وغیرہ۔ لیکن (بیرونی زبانیں ان کی بہ نسبت ترقی کرچکی ہیں اور حالت تفصیلی (انالیٹکل اسٹیج) سے صورتِ ترکیبی (سنتیٹھک) میں پہونچ چکی ہیں۔ لسانیات کا یہ اہم اصول ہے کہ زبانیں پہلے حالت تفصیلی میں ہوتی ہیں اور اس کے بعد رفتہ رفتہ شکل بدل کر ترکیبی صورت اختیار کرلیتی ہیں، تقریباً تمام اندرونی زبانیں حالتِ تفصیلی میں ہیں۔ مثلاً اُردو میں حالتِ فاعلی "کا، کی کے" لگا کر بنائی جاتی ہے۔ یہاں (کا) اسم سے الگ بھی ایک معنٰی رکھتا ہے لیکن بنگالی (بیرونی زبان) میں یہی (اِر) لگاکر بنتی ہے اور یہ علامت اس وقت اسم کا ایک جزو بن جاتی ہے۔

(۳) دونوں گروہوں کی زبانوں میں ایک اور بھی نمایاں فرق نظر آتا ہے بیرونی زبانوں کے فعل ماضی سے اس کے فاعل کی تجنیس اور تعداد کا پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن اندرونی زبانوں میں ہر قسم کے فاعل کے ساتھ فعل کی ایک ہی شکل رہتی ہے، مثلاً اُردو میں (میں گیا) (تو گیا) (وہ گیا) یہاں فعل "گیا" یکساں رہتا ہے۔ لیکن بنگالی کے لفظ "ماری لام" سے فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ مارنے والا (میں) ہے جب کہ اُردو کے (مارا) سے پتہ نہیں چلتا کہ میں نے مارا، یا تو نے مارا، یا اُس نے مارا۔

گریرسن نے اس سلسلہ میں تاریخی استدلال بہت کم پیش کیا ہے صرف مذکورہ بالا لسانی مفروضات پر

وہ زبانوں کی اس گروہ بندی کو صحیح سمجھتا ہے ۔ لسانیات کی دنیا میں گریرسن کی تحقیق کے اس حصہ سے جتنا اختلاف کیا گیا ہے اس کی نظیرنہیں ملتی۔ آریائی زبانوں کے نئے محققوں نے مبسوط لسانیاتی دلائل سے گریرسن کے اس نظریہ کا بطلان پیش کیا ہے ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر چٹرجی کا نام پیش پیش ہے ۔ بی ۔ مزمدار کا خیال ہے کہ گریرسن ہندوستان کی قدیم زبانوں سے کماحقہٗ واقف نہ تھا ۔ اس لئے اس کے لسانیاتی فیصلے قول فیصل کا حکم نہیں رکھتے ان کا خیال ہے کہ گریرسن نے اپنے نظریہ کی تائید میں فرہنگ اور صوتیات پر غیر معمولی زور دیا ہے حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ زبان کے کینڈے کو سمجھنے میں ان سے کہیں زیادہ مدد اس کے صرفی اور نحوی قاعدوں سے ملتی ہے۔ گریرسن کے بعض لسانی دلائل کا بطلان :۔

(۱) (س) کا (ہ) میں تبدیل ہوجانا بیرونی زبانوں کی خصوصیت نہیں ہے۔ اس کی مثالیں خود مغربی ہندی (خالص اندرونی زبان) میں مل جاتی ہیں ۔ جیسے : ۔ سنسکرت : تسّیہ ، تسّ ، تاس ، تاہ ، تا (تاکو ۔ تاہی وغیرہ برج بھاشا میں آج بھی بولتے ہیں)اسی طرح سنسکرت: ۔ کرشیتی ، کرسِدّی ۔ کرسئ ۔ کری ہسئ ۔۔ (اپ بھرنش)کری ہے برج بھاشا میں بن جاتا ہے۔ علاوہ ازیں بیرونی زبانوں میں اکثر جگہ اس کا استعمال پایا جاتا ہے مثلاً راجستھانی (کرسی) لہندا(مغربی پنجابی)۔(کرے سی) کرے گا ۔ اسی طرح تقریباً تمام جدید آریائی زبانوں میں (اندرونی اور بیرونی دونوں) اعداد کا (س) ، (ہ) میں تبدیل ہوجاتا ہے جیسے گیارہ ، بارہ ، چوہتّر (چوستر) جسے گجراتی (جسے گریرسن زبانوں کی اندرونی صف میں جگہ دیتا ہے) کی بعض بولیوں میں "(س)" (ہ) میں تبدیل ہوجاتا ہے مثلاً سنسکرت : سپت ، اُردو۔ سات ،گجراتی ، ہات۔

(۲) بیرونی زبانوں کی طرح مغربی ہندی میں بھی علامتوں کا خیال نہیں رکھا جاتا ، بنگالی اور مراٹھی کی طرح اس میں بھی بعض اوقات لفظ کو توڑ مروڑ کر علامتوں کا مفہوم نکال لیا جاتا ہے۔ مثلاً اردو میں " آنکھوں " بمعنی " آنکھوں سے "

ع ۔ خسرو واکو آنکھوں دیٹھا۔ (امیر خسرو)بمعنی آنکھوں سے دیکھا۔

پُرانی اردو میں (میں نے) کی جگہ (زیادہ تر) (میں) استعمال ہوتا تھا اَپ بھرنش کی یہ روایت میرو سوداؔ کے زمانہ تک قائم رہی ہے۔ اسی طرح اردو میں۔ وہ بھوکوں مرگیا ، برج بھاشا : بابھو کن مرگیو ، بہ معنی بھوک سے مرگیا ، " سے "کا مفہوم ان جملوں میں چھپا ہوا ہے ۔ اس کے برعکس لہندا (مغربی پنجابی) میں جسے گریرسن بیرونی زبانوں میں شمار کرتا ہے۔ علامتیں علیٰحدہ سے لگائی جاتی ہیں۔ مثلاً گھوڑے وا (گھوڑے کا) یا (گھوڑے نوں) بمعنی (گھوڑے کو)۔ اس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ جن اصولوں کو بیرونی زبانوں کی خصوصیت گردانا گیا ہے وہ تھوڑی بہت اندرونی زبانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ بیرونی زبانوں میں بعض خصوصیات ایسی لکھی ہیں جو جنوبی اور مشرقی ہندوستان کی بیرونی زبانوں میں تو مشترک ہیں لیکن مغربی ہندوستان کی بیرونی شاخ میں پائی

جاتیں ، مثلاً ان زبانوں میں ماضی مطلق کی علامت " ل" ہے (اُٹھا) کے لئے مراٹھی (اُٹھیلا) بنگالی (اُٹھیل) بہاری (اُٹھل) آسامی (اُٹھل) اڑیا (اُٹھل) اڑیا (اُٹھیلا) لیکن شمالی مغربی ہندوستان کی علامت ماضی "ل" نہیں بلکہ الف ہے۔ جیسے اٹھا ، پڑا ، چلا

چنانچہ ہمیں یہاں گریرسن سے اختلاف کرتے ہوئے چڑجی کی اس رائے سے متفق ہونا پڑتا ہے کہ اندرونی ، بیرونی زبانوں کی تقسیم لسانی اعتبار سے اتنی ہی مہمل ہے جتنی کہ تاریخی استدلال سے۔

اب ہم ڈاکٹر چڑجی کے لسانی نقشہ میں تھوڑی سی ترمیم کرنے کے بعد ہندوستان کی جدید زبانوں کی گروہ بندی حسب ذیل طریقے پر کرتے ہیں۔

(الف) مدھیہ پردیش کی زبان خاص

(۱) مغربی ہندی

(ب) درمیانی زبانیں

(۱)مدھیہ دیش کی زبان سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبانیں۔

(۱) پنجابی ۲۔ راجستھانی ۳۔ گجراتی ۴۔ پہاڑی بولیاں

(۲)بیرونی زبانوں سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبان۔

(۱) پوربی ہندی

(ج) شمالی مغربی ہندوستان کی زبانیں

(۱)لہندا (مغربی پنجابی) ۲۔ سندھی

(د) مشرقی ہندوستان کی زبانیں

(۱) بہاری ۲۔ اُڑیا ۳۔ بنگالی ۴۔ آسامی

(ر) جنوبی ہندوستان کی آریائی زبانیں

(۱) مراٹھی

مذکورہ بالا زبانوں کی تفصیلات

شمال مغربی ہندوستان کی زبانیں

لہندا : یہ مغربی پنجاب کی زبان ہے ، اس کے اور مشرقی پنجابی کے حدود کچھ اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ

بعض سرحدی اضلا ع کے اندر دونوں میں امتیاز کرنا دشوار ہوجاتا ہے ۔ لہندا پر دُردیا پشا چ زبانوں کا اثر بہت زیادہ پڑا ہے ،۔ مغربی پنجاب میں "کیکئے " دیس بھی شامل ہے ۔ جہاں قدیم زما نے میں پشاچی پراکرت اور برا چڈ اَپْ بھرنش بولی جاتی تھیں ۔۔ لہندا مغربی پنجابی ، جا ٹکی ، ہند کی یا اُچی کے ناموں سے بھی مشہور ہے ۔لیکن ان میں سب سے بہترنام لہندا ہی ہے ۔ اس کے معنی " سمت مغرب " کے ہیں ۔ لہندا میں کوئی ادبی کارنامہ نہیں ملتا۔ یہ اپنی قواعد اور فرہنگ دونوں اعتبار سے مشرقی پنجابی سے مختلف ہے اس کا اپنا رسم الخط لنڈا ہے لیکن آ ج کل یہ فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے ۔

(۲) سندھی : یہ صوبہ سندھ کی بولی ہے ، اس کے بولنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ اس لئے اس میں عربی فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال کیے جا تے ہیں، اس کا رسم الخط بھی عربی ہے ۔ اس کی پانچ بولیاں ہیں جن میں وسطیٰ علا قے کی "بچول" بولی نے تھوڑی بہت ادبی حیثیت اختیار کرلی ہے ۔ سندھی کا تعلق برا چڈاَپْ بَھرنش سے ہے ۔ آریائی زبانوں میں یہ واحد زبان ہے جس پر عربی کے براہ راست اثرات پڑے ہیں ۔

لہندا اور سندھی دونوں دو آبہ کی زبانوں سے بالکل مختلف ہیں ، اس لئے اردو کے آغاز کا سلسلہ ان زبانوں سے نہیں ملا یا جاسکتا گو مسلمان اول اول انھیں زبانوں کے علا قے میں داخل ہوئے تھے ۔

جنوبی ہندوستان کی آریائی زبان

مراٹھی: مہاراشٹر کی زبان ہے اس کے جنوب میں دَراوڑ زبانو ں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے ۔ اس کی تین خاص بولیاں ہیں جن میں سے پونا کے اطراف کی بولی نے ادبی مراٹھی کی حیثیت اختیار کرلی ہے اس کا رسم الخط دیوناگری ہے ۔ ادبی سرمایہ کے اعتبار سے ہندوستان کی ممتاز ترین زبانوں میں شمار کی جاتی ہے ۔

ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں میں گجراتی کے علاوہ مراٹھی ایک ایسی زبان ہے جس میں صیغہ تثنیہ ملتا ہے ۔ یہ پنجابی اور گجراتی کی طرح برج بھاشا کے برعکس (و) اور (ب) کے تلفظ میں فرق کرتی ہے ۔ مغربی ہندی کی طرح اسماء کا اختتام اس میں بھی الف پر ہوتا ہے اور جمع (اے) جوڑکر بنائی جاتی ہے ۔

دکنی کی ساخت پر داخت میں اس کا حصہ صرف اس قدر ہے کہ اس کے بعض اسماء ، حرف اور افعال دکنی میں مستعمل ہیں ۔ مثلاً : ۔کِتیک = کئی ایک (قطب مشتری): بسلا = بیٹھا ، بسلانا = بٹھانا ، اور دکنی کے کلیدی لفظ نکو (نہیں) اور " چ " تاکیدی ، آپیچ (آپ ہی) خدا چ (خدا ہی) وغیرہ ۔ دکنی میں سنسکرت اور اَپْ بَھرنش کے الفاظ کا جو عام رجحان ملتا ہے اس کی تائید مراٹھی نے بھی کی ہے ۔

مشرقی ہندوستان کی زبانیں

(ا) آسامی : آسامی پر ہندوستان کی آریائی زبانوں کاسلسلہ مشرق میں ختم ہوتا ہے۔ اُڑیا کی طرح آسامی

بھی بنگالی کی بہن ہے نہ کہ بیٹی ۔ اگرچہ آسامی قواعد بنگالی سے زیادہ مختلف نہیں دونوں کے ادبی رجحانات میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۲) بنگالی : یہ ریاست بنگال اور بنگلہ دیش کی زبان ہے۔ دیہاتی بنگالی اور شہری بنگالی میں زمین آسمان کا فرق ہے ادبی بنگالی میں سنسکرت کے خالص الفاظ کی جتنی بھرمار ملتی ہےاس کی مثال اگرہندوستان کی کسی دوسری زبان میں ملتی ہے تو وہ نئ ہندی ہے ۔ ادبی زبان کی نیو بنگالی کے اس روپ پر ہے جو ہگلی کے آس پاس چوبیس پرگنہ میں بولی جاتی ہے ۔ بنگالی صوتیات کی خصوصیات یہ ہیں کہ (ا) کا (اُو) اور (س) کا (ش) ہو جاتا ہے ۔ بنگالی رسم الخط براہمی ہی کی ایک شکل ہے ۔

(۳)اُڑیا : یہ اڑیسہ (قدیم ات کل دیس) میں بولی جاتی ہے اس لیے اس کو اُتکلی یا اوڈری بھی کہتے ہیں ۔ اڑیا رسم الخط بہت مشکل ہے اس کی قواعد بنگالی سے بہت ملتی جلتی ہے ۔ اس لیے بنگال کے پنڈت عرصہ تک ا سے بنگالی زبان کی ایک بولی گردانتے رہے، لیکن یہ سیاسی مصلحت اور لسانی غلطی تھی ۔ اڑیا دراصل بنگالی کے ساتھ ساتھ بارہویں صدی عیسوی میں ماگدھی اَپْ بھَرنش سے جنم لیتی ہے ۔ بنگالی اور اڑیا کا رشتہ ماں بیٹی کا نہیں بہنوں کا ہے ۔ مرہٹوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے اس میں مراٹھی کے الفاظ بھی کثرت سے ملتے ہیں ۔

(۴) بہاری : تمدنی اعتبار سے صوبہ بہار کا تعلق یو،پی سے رہا ہے ، لیکن لسانی اعتبار سے اس کی بولیاں بنگالی سے زیادہ قریب ہیں ، بنگالی ، اڑیا اور آسامی کی طرح اس کی پیدائش بھی ماگدھی اَپْ بھَرنش سے ہوئی ہے ۔ بلکہ ایک لحاظ سے یہ ماگدھی اَپْ بھَرنش کی سچی جانشین ہے کیونکہ یہ اسی علا قے میں بولی جاتی ہے ۔ بہاری کی تین بولیاں قابِل ذکر ہیں۔

(ا) میتھلی :۔ جو گنگا کے شمال میں دربھنگہ کے آس پاس بولی جاتی ہے ۔

(۲) مگہی :۔ جس کا مرکز گیا اور پٹنہ سمجھنا چاہیئے ۔

(۳) بھوج پوری :۔ جو یو۔ پی کی گورکھپور اور بنارس کی کمشنریوں اور بہار کے شاہ آباد ، چمپارن وغیرہ کے اضلا ع میں بولی جاتی ہے ۔

ان میں میتھلی اور مگہی ایک دوسرے سے قریب اور بھوج پوری دونوں سے کسی قدرمختلف ہے ڈاکٹر چٹرجی، بھوج پوری کو میتھلی اور مگہی سے اس قدر مختلف مانتے ہیں کہ وہ اُ سے بہاری بولیوں سے علٰیحدہ شمار کرتے ہیں ۔ بہار میں تین رسم الخط رائج ہیں ۔ لکھائی چھپائی میں دیو نا گری استعمال ہوتا ہے ۔ عام تحریروں میں کیتھی رسم الخط برتا جاتا ہے ۔ ان کے علاوہ میتھلی کہتے ہیں جو بنگالی رسم الخط سے ملتا جلتا ہے ۔ اس علاقہ کی ادبی زبانیں اُردو اور ہندی ہیں۔

مشرقی ہندوستان کی زبانوں سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبان :۔

مشرقی ہندی: مشرقی یا پوربی ہندی، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مغربی ہندی کے پورب میں بولی جاتی ہے یہ اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے مغربی ہندی سے ملتی جلتی ہے اور بعض دوسری خصوصیات کے لحاظ سے بہاری سے لیکن اس کا گہرا رشتہ مشرقی ہندوستان کی زبانوں (بہاری، بنگالی) وغیرہ ہی سے ہے۔ اس کی تین خاص بولیاں ہیں (۱) اودھی (۲) بگھیلی ۔۔ (۳) چھتیّس گڑھی ۔ کوسلی، اودھی کا دوسرا نام ہے۔ کیلاگ اور گریرسن نے سب سے پہلے مشرقی ہندی کو ایک علیٰحدہ زبان کی حیثیت دی ہے اس سے قبل ا سے ہندی ہی کی ایک شاخ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے افعال پر مغربی ہندی کا اثر صاف نظر آتا ہے، لیکن اسماء اور ضمائر کے اعتبار سے یہ ہندوستان کی مشرقی زبانوں سے زیادہ قریب ہے۔ یہ ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ مغربی اودھی میں فعل کی معمولی شکل برج بھاشا کی طرح ہوتی ہے۔ جیسے، (آون، جاون، کرن) لیکن مشرقی اودھی میں فعل کے آخر میں (ب) آتی ہے۔ جیسے (آب، جاب، کرب) فعل ماضی کے لئے مشرقی ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح (س) آتا ہے۔ جیسے ماریس کیئس وغیرہ۔

مشرقی ہندی کی سب سے اہم بولی اودھی کو ہندی ادب میں ایک خاص مرتبہ حاصل ہے ۔ اس کے دو مشہور شاعر ملک محمد جائسی اور تلسی داس ہیں جو ہندی ادب کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔

مدھیہ دیش کی زبان سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبانیں

پہاڑی بولیاں

پوربی پہاڑی: یہ نیپال میں بولی جاتی ہے ۔ اس کو نیپالی، پربتیا، گورکھالی اور سُکھ کُرابھی کہتے ہیں۔ اس کا سب سے نکھرا روپ کاٹھ منڈو کی گھاٹی میں بولا جاتا ہے۔ یہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

درمیانی پہاڑی: اس کی دو شکلیں ہیں۔

(۱) کمایونی۔ جو الموڑہ، نینی تال کے اضلا ع میں بولی جاتی ہے۔

(۲) گڑھوالی :۔ جو ریاست گڑھوال اور مسوری کے پہاڑی علا قے میں بولی جاتی ہے۔

مغربی پہاڑی: اس زبان کی کئی بولیاں ہیں جو شملہ اور اس کے آس پاس کے پہاڑی علا قے میں بولی جاتی ہیں اس علا قے میں تقریباً بیس بولیاں رائج ہیں۔ ان میں تحریری ادب نہیں ملتا۔

مذکورہ ٔبالا سب پہاڑی زبانیں راجستھانی سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہیں ۔ خاص طور سے درمیانی پہاڑی کا تعلق جے پوری اور مغربی پہاڑی کا تعلق ماڑواڑی سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں اکثر راجپوت قبائل راجپوتانہ سے نکل کر یہاں بس گئے تھے ۔ اسی وجہ سے یہاں کی

بولیوں پر راجستھانی زبان کا گہرا اثر پڑا۔

گجراتی : گجراتی زبان کاٹھیاواڑ، ریاست بڑودہ اور اس کے آس پاس کے اضلاع میں بولی جاتی ہے اس کے مختلف بولیوں میں دوسری زبانوں کی طرح زیادہ اختلاف نہیں پایا جاتا ۔ گجراتی زبان کا یہ نام گوجروں کی نسبت سے ہے جو سنہ ۴۰۰ تا سنہ ۶۰۰ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں باہر انہیں گوجروں کی نسبت سے پڑے ہیں۔ یہ گوجر بعد کو گجرات میں بھی جاکر بس گئے تھے۔

مغربی ہندی، راجستھانی اور پنجابی کی طرح گریرسن گجراتی کو بھی اندرونی زبانوں کی فہرست میں جگہ دیتا ہے ۔ دراصل گجرات کی اصل زبان بیرونی ۔۔ شاخ سے تعلق رکھتی تھی جس کے بعض لسانی اثرات اب تک اس زبان میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً (۱) س اور ہ کے تلفظ کا ادا نہ کرسکنا (۲) اسماء کی غیر فاعلی حالت میں (ل) کا برقرار رکھنا (۳) ماضی مطلق میں (ل) علامت کا مراٹھی اور مشرقی ہندوستان کی زبانوں کی طرح استعمال۔

ویدی زمانہ سے موجود عہد تک گجراتی زبان کے تسلسل کی جس طرح نشان دہی کی جاسکتی ہے اس کی نظیر ہمیں ہندوستان کی دوسری زبانوں میں نہیں ملتی ۔ راجپوتوں کے عہد میں متھرا والوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے جدید گجراتی اپنی قواعد کے اعتبار سے مغربی ہندی بالخصوص برج بھاشا سے کافی متاثر ہوئی، اسماء اور افعال کے اعتبار سے یہ مغربی ہندی کی پیروی کرتی ہے، لیکن اردو کی (ڑ) اور(ڑھ) کے مقابلے میں اس میں (ڈ) اور (ڈھ) زیادہ پائی جاتی ہیں جودکنی کی بھی عام خصوصیت ہے۔

راجستھانی :ایک طرح سے یہ مدھیہ دیش کی زبان ہی کا جنوب مغربی پھیلاؤ ہے ، اس پھیلاؤ کی آخری کڑی جیسا کہ لکھا جاچکا ہے گجراتی زبان ہے ۔ جس علاقہ میں آج کل پنجابی (مشرقی) گجراتی اور راجستھانی زبانیں (جن کا شمار گریرسنؔ اندرونی زبانوں میں کرتا ہے) بولی جاتی ہیں وہاں قدیم زمانہ میں بیرونی شاخ کی زبانیں رائج تھیں۔

رفتہ رفتہ سیاسی فتوحات کی بنا پر اندرونی زبانوں نے ان علاقوں کی ۔ زبانوں کو ڈھکیلنا شروع کیا لیکن گجراتی اور پنجابی کی طرح راجستھانی میں بھی بیرونی زبانوں کے بعض نشانات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً (اَ) (اِ) (اے) اور (اُو)کا تلفظ ، عام تلفظ سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح (چھ) کا تلفظ (س) سے ملتا جلتا ہوتا ہے اور (س) کی آواز عام طور سے (ہ) میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

راجستھانی کی چار اہم بولیاں ہیں :۔

(۱) مارواڑی یا میواڑی : ۔ یہ جودھ پور، بیکانیر، جیسلمیر اور اودے پور کی ریاستوں میں بولی جاتی ہے

(۲) مالوی :۔ اس کا مرکز سابق ریاست اندور تھا۔

(۳) جے پوری :۔ یہ جے پور، کوٹہ اور بوندی کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔

(۴) میواتی :۔ یہ الور اور دہلی کے جنوب میں گوڑگاؤں میں بولی جاتی ہے۔قدیم اردو کی ساخت پرداخت میں اس کا بھی حصّہ رہا ہے حالاں کہ اس پر تحقیق کم ہوئی ہے کیوں کہ ادبی اعتبار سے یہ بولی کوئی اہمیت نہیں رکھتی ۔ اردو پر بانگڑوزبان کے اثرات کے سلسلے میں کسی اگلے باب میں اس کے لسانی اثرات کو بھی پہچاننے کی کوشش کی گئی ہے۔

راجستھانی کے علاقوں میں اردو ، ہندی ادبی زبانوں کی حیثیت سے رائج ہیں ۔ اس کا قدیم ادب زیادہ تر مارواڑی میں ملتا ہے پرانی مارواڑی اور گجراتی میں بہت کم فرق ہے۔ اس کا قدیم ادب ڈِنگل (برج بھاشاپِنگل) کے نام سے مشہور ہے۔ جے پوری میں ادب ملتا ہے دادودیال اور ان کے چیلوں نے اسی میں شاعری کی ہے ۔ ان چاروں بولیوں کی ساخت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جے پوری اور مارواڑی ، گجراتی سے، میواتی برج بھاشا سے اور مالوی بندیل کھنڈی سے ملتی جلتی ہیں ۔ راجستھان کے بیشتر افعال مغربی ہندی کی نہج پر ہوتے ہیں ۔ برج بھاشا کی طرح مستقبل کے لیے اس میں بھی دو علامتیں مستعمل ہیں (ہوں)اور (گو) یہاں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ علامت مستقبل (گ) جسے پروفیسر شیرانی پنجاب کی خصوصیت بتاتے ہیں (گو) یا (گ) کی شکل لے کر برج اور راجستھانی کی بعض بولیوں میں بھی مستعمل ہے لیکن جملوں کی ترتیب ، الفاظ کی دروبست اور بعض صرفی و نحوی قاعدوں کے اعتبار سے اس میں اور گجراتی میں گہری مماثلت دکھائی دیتی ہے۔

پنجابی : لفظ پنجابی کا اطلاق عام پر ان تمام بولیوں پر کیا جاتا ہے جو دریائے سندھ سے لے کر ضلع انبالہ تک بولی جاتی ہیں ۔ سب سے پہلے گریرسن نے اپنے لسانی جائزہ میں اس بات کو واضح کیا تھا کہ لاہور کے مغرب میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے اندرونی بولیوں سے بالکل مختلف ہے ۔ وہ اس زبان کولہندا یا مغربی پنجابی کا نام دیتا ہے اور ا سے بیرونی زبانوں کی فہرست میں رکھتا ہے ۔ اس طرح اس نے مغربی پنجابی اور پنجابی (مشرقی) میں امتیاز کیا ہے ۔ پنجابی پورے پنجاب کی زبان نہیں یہ مشرقی پنجاب ، ریاست بیکانیر کے شمالی اضلا ع اور ریاست جموں کے جنوبی اضلا ع کی زبان ہے ۔ مغرب میں یہ لہندا یا مغربی پنجابی،شمال اور شمال مشرق میں پہاڑی زبانوں اور جنوب میں باگر اور بیکا نیری بولیوں سے گھری ہوئی ہے ۔ مشرق میں اس کے حدود مغربی ہندی کی دو بولیوں یعنی کھڑی بولی اور بانگڑو (ہریانوی) سے ملتے ہیں، چنانچہ مشرقی انبالہ، کرنال، ریاست پٹیالہ ضلع حصار کے مشرقی حصّے ، رہتک ،گوڑگاؤں اور ریاست دہلی کی زبان پنجابی نہیں بلکہ کھڑی بولی (ہندوستانی) یاہریانوی ہے ۔ان ۔ علاقوں کو چھوڑ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سارے مشرقی پنجاب کی زبان پنجابی ہے۔ پنجابی اور مغربی ہندی کی بولیوں کے درمیان حد بندی دریائے گھگھر سے کی جاسکتی ہے ۔ دریائے گھگھر کے مشرق میں چند سکھ آبادیوں کو چھوڑ کر باقی سارے علاقہ کی زبان کھڑی بولی یا بانگڑو (ہریانوی) ہے۔

پروفیسر محمود شیرانی " پنجاب میں اردو" لکھتے وقت اس لسانی حقیقت کو بالکل فراموش کردیا ہے کہ گجراتی اور راجستھانی کی طرح پنجابی زبان کا تعلق بھی قدییم زمانے میں زبانوں کی بیرونی شاخ سے تھا جس کے نشانات جدید پنجابی تک میں ملتے ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ موجودہ پنجابی کی ساخت اس بات کا بھی پتہ دیتی ہے کہ اس پر کسی زمانہ میں مدھیہ دیش کی زبان، جس کی نمائندہ بولیاں آج کل برج بھاشا اور کھڑی بولی ہیں ، کی چھاپ نہایت گہری پڑچکی ہے ۔ اس کا ثبوت ہمیں اس بات سے ملتا ہے کہ لہندا اور پنجابی کے درمیان خطِ فاصل قائم کرنا دشوار ہے ۔ دونوں زبانیں اس غیر محسوس طریقے پر گھُل مِل جاتی ہیں کہ گریرسن کو یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ دراصل کسی زمانے میں سارے پنجاب پر لہنداکی ایک نہ ایک شکل چھائی ہوئی تھی جسے اندرونی زبان نے پیچھے ڈھکیلنا شروع کیا اور رچنا دو آب تک ہٹا دیا اس اندرونی زبان کے نشانات لہندا میں سندھ ساگردو آب تک پائے جاتے ہیں ۔ اندرونی زبان کا رنگ جوں جوں ہم مشرق کی طرف آتے ہیں گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی لیے پنجابی کو گجراتی اور راجستھانی کی طرح ، ملواں، زبان مانا گیا ہے ۔ گریرسن نے اپنی بعد کی تحریروں میں ا سے صاف طور پر زبانوں کی درمیانی صف میں جگہ دی ہے ۔ اس کی تائید میں اس تاریخی حقیقت کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ فتوحات کا بھاؤ ہمیشہ شمال مغرب سے دو آبہ کی طرف رہا ہے لیکن سیاسی اقتدار کا مرکز ہر عہد میں گنگا جمنا کے میدانوں میں رہا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا رہا ہے کہ دو آبہ کی زبانیں اپنے تنگ علاقوں سے نکل کرآس پاس کی زبانوں پر چھاپہ مارتی اور چھاپ چھوڑتی رہی ہیں ۔ مسلم عہد میں تو پنجاب اور گجرات کی حیثیت ہمیشہ صوبوں کی رہی ہے جو سدا مرکز سے تمدنی اورلسانی اثرات قبول کرتے رہے ہیں۔

گریرسن کے خیال میں معیاری پنجابی باری دوآب کی بولی " ماجھی " ہے جس کا مرکز امرتسر ہے ۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس زبان کے ابتدائی یورپی اسکالروں نے لدھیانہ کی زبان کو معیاری پنجابی مانا ہے۔ لدھیانہ عرصہ تک انگریز مشنریوں کا اڈّا رہا ہے اس لیے انھوں نے قواعد لکھتے وقت وہیں کی زبان کو ملحوظ رکھا ہے ۔ مخی آواز (ل) کا ذکر ان کی قواعدوں میں ملتا ہے، ماجھی میں اس کا نام و نشان بھی نہیں ملتا ۔ مخی /ل/برج بھاشا میں بھی نہیں ملتا ۔ البتّہ کھڑی بولی ، مشرقی پنجاب اور بانگڑو (ہریانوی) کے علاقوں میں یہ سننے میں آتا ہے ۔ بانگڑو سے منتقل ہوکر یہ راجستھانی میں بھی آگیا ہے ۔ ادبی اردو اور ہندی میں تو اس کا استعمال گنوارو سمجھا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اردو برج بھاشاکی پیرو ہے۔

مغربی ہندی اوراس کی بولیاں

مغربی ہندی کے حدود تقریباً وہی ہیں جو مدھیہ دیش کے ہیں ۔ یہ مغرب میں سر ہند سے لے کر مشرق میں الہ آباد تک ، شمال میں ہمالیہ کے دامن سے لے کر جنوب میں وندھیا چل تک بولی جاتی ہے اس کے شمال مغرب میں پنجابی زبان ہے اورجنوب مشرق میں مراٹھی اور مشرقی ہندی شمال میں یہ پہاڑی بولیوں

(جونسری،گڑھوالی اور کمایونی) سے گھِری ہوئی ہے اندرونی زبان کی شاخ میں صرف مغربی ہندی ایک ایسی زبان ہے جسے ہم خالص اندرونی زبان کہہ سکتے ہیں بلکہ اگر پنجابی ، راجستھانی اور گجراتی کی ملواں حیثیت پر نظر رکھیں تو اندرونی گروہ کی نمائندہ زبان محض مغربی ہندی ہے۔ مغربی ہندی کا یہ نام مدھیہ دیش کی زبان کو گریرسن نے دیا ہے جس نے سب سے پہلے مشرقی اور مغربی ہندی میں فرق کیا ہے۔ مغربی ہندی مدھیہ دیش کی زبان ہونے کی وجہ سے ہند آریائی زبان کی بہترین نمائندہ ہے ، کیونکہ اسی علاقہ میں سنسکرت شورسینی پراکرت اور شَورسینی اَپْ بَھرنش پروان چڑھتی ہیں جن کی سچی جانشین اس علاقے کی جدید بولیاں کھڑی بولی (ہندوستانی) برج بھاشا ، ہریانی ، بندیلی اور قنوّجی ہیں جن کے مجموعے کو گریرسن مغربی ہندی کا جدید نام دیتا ہے۔

لسانیاتی اعتبار سے مغربی ہندی کا تعلق براہ راست شورسینی اَپْ بھرنش سے ہے جو اس عہد کی بولیوں میں واحد اور ممتاز ادبی حیثیت کی مالک تھی ، جس نے سب سے زیادہ سنسکرت کے اثر کو قبول کیا تھا۔ ہر عہد میں اس علاقہ کی زبان کا مرکز متھرا رہا ہے جو قدیم ہندی تمدّن کا اہم مرکز تھا۔ اس سے قبل اَپ بھرنش کے باب میں یں لکھا جاچکا ہے کہ یہ اَپ بھرنش راجپوتی عہد میں مسلّمہ طور سے لاہور سے لے کر بنگال تک ادبی حیثیت سے رائج تھی ۔ قدیم بنگالی شاعری کے نمونے اِس بات کے شاہد ہیں ، مغرب میں اس کی شمال مغربی بولیاں (کھڑی بولی اور ہریانوی) اپنے اپنے علاقوں سے نکل کر لاہور تک دھاوے مارتی تھیں جس کا نتیجہ آج ہم مشرقی پنجابی کی شکل میں پاتے ہیں ۔ جنوب مغرب میں گجراتی اور راجستھانی زبانوں کو نوعیت بھی کچھ اسی قسم کی ہے جو کسی زمانہ میں بیرونی زبانوں سے تعلق رکھتی تھیں لیکن جن پر شَور سینی اَپْ بَھرنش کا اتنا گہرا اثر پڑا ہے کہ ان کا شمار اندرونی زبانوں میں کیا جاسکتا ہے۔

مغربی ہندی اور اس کی بولیوں کی اپنی صوتی ، صرفی اور نحوی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اس زبان کو ایک علٰیحدہ اور ممتاز حیثیت دی گئی اور جن کا تفصیلی مطالعہ کسی بعد کے باب میں کیا جائے گا۔ لیکن مغربی ہندی کی سب سے بڑی خصوصیت کا ذکر (جو کہ اس کی تمام بولیوں کی مشترک خصوصیت بھی ہے) کردینا ضروری ہے اندرونی زبانوں میں مغربی ہندی کی یہ ممتاز حیثیت ہے کہ اس کی قواعدکا عام رجحان تفصیلی ہے جو بعض بولیوں (مثلاً کھڑی) میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے اس میں صحیح معنوں میں صرف ایک زمانہ فعل کے لئے اور صرف ایک حالت اسماء کے لئے پائی جاتی ہے۔ اسماء اور افعال کی دیگر تمام حالتیں حروف ، فعلِ امدادی اور سابقوں ، لاحقوں کی مدد سے بنائی جاتی ہے۔

گریرسن نے مغربی ہندی کی پانچ بولیاں گِنائی ہیں جن کے نام حسبِ ذیل ہیں :

(۱) کھڑی بولی یا ہندوستانی (۲) ہریانوی ،جاٹو یا بانگڑو (۳) برج بھاشا (۴) قنوّجی (۵) بُندیلی۔

شورسینی اُپْ بھرنش اپنے آخری دَور میں دو نمایاں شکلیں اختیار کرلیتی ہے ۔ پہلی شکل میں افعال و

اسماء کا اختتام عام طور سے (اَ) پر ہوتا ہے اور دوسری شکل میں (اُو) پر کھڑی بولی اور ہریانوی میں عام طور سے یہی شکل ملتی ہے، جو گریرسن اور شیروانی کے خیال میں پنجابی سے لی گئی ہے۔ (اُو) والی شکل برج بھاشا، قنوّجی اور بُندیلی میں پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے پنڈت چندر دھرشرما گلیری انھیں کھڑی بولی کے مقابلے میں "پڑی بولی" کا نام دیتے ہیں۔ اُردو نے اپنے دورانِ اتقاء میں (اُو) کی شکل کو کبھی کبھی اختیار نہیں کیا۔

مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) (اُو) کو ترجیح دینے والی بولیاں :۔ (۱) برج بھاشا (۲) بُندیلی (۳) قنوّجی۔

(ب) (اَ) کی شکل رکھنے والی بولیاں :۔ (۱) ہریانی (۲) کھڑی بولی۔

برج بھاشا

مغربی ہندی کی سب سے نمائندہ بولی یا استعارہ میں اس کی سب سے عزیز بیٹی برج بھاشا ہے۔ یہ کھڑی بولی کے مقابلہ میں شورسینی اَپْ بھرنش اور پراکرت کی سچی جانشین ہے۔ اس کا مرکز برج (متھرا) کا علاقہ ہے۔ لیکن یہ جنوب میں آگرہ، بھرت پور، دھول پور، کرولی، ریاست گوالیاراور جے پور کے مشرقی اضلا ع تک پھیلی ہوئی ہے۔ شمال میں یہ گوڑگاؤں ضلع کے مشرقی حصص تک رائج ہے۔ اس لیے اس کا شمار بھی نواح دہلی کی بولیوں میں ہوسکتا ہے۔ شمال مشرق کی جانب یہ بلند شہر، ایٹہ، مین پوری، بدایوں اور بریلی کے اضلا ع ہوتی ہوئی نینی تال کے ترائی پرگنوں تک رائج ہے۔ متھرا کی برج معیاری مانی جاتی ہے۔ دوسرے اضلا ع کی برج بھاشا میں مقامی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بلند شہر کے ضلع میں یہ کھڑی بولی سے گھُل مِل جاتی ہے۔ جے پور میں یہ راجستھانی کے اثرات قبول کرلیتی ہے۔ شمال میں گوڑ گاؤں کے ضلع میں اس پر میواتی کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ برج بھاشا کے مشرقی اضلا ع کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ بعض حروف صحیح ایک دوسرے میں ضم ہوجاتے ہیں۔ مثلاً خرچ کا کھچّو۔ مرتا کامتّ اے، ٹھاکر صاحب کا ٹھکسّا، نوکرانی کا نوکنّی۔

برج بھاشا کا مرکز جیسا کہ اُوپر لکھا جاچکا ہے متھرا ہے، متھرا ہندو تہذیب و تمدّن کا مرکز ہونے کے علاوہ سنسکرت زبان کا گہوارہ رہا ہے۔ اِس لیے برج بھاشا بھی سنسکرت کی طرح کہنگی لیے ہوئے ہے۔ اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ اِس میں اسمائے غیر جنس کو برقرار رکھا گیا ہے۔ شمالی ہندکی دیگر بولیوں میں یہ اب متروک ہیں۔ اس کے تاریخی اور لسانی ارتقا پر روشنی اگلے باب میں ڈالی گئی ہے۔

بُندیلی یا بُندیل کھنڈی

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بندیلی، بندیل کھنڈ میں بولی جاتی ہے اور اِس کے بولنے والے بُندیلے کہلاتے

ہیں ۔ جغرافیائی تقسیم کے اعتبار سے بندیل کھنڈ میں باندا ، ہمیر پور جالون اور جھانسی کے اضلا ع اور سنٹرل انڈیا کی اکثر سابق ریاستیں شامل ہیں ۔ لیکن بندیلی زبان کا علاقہ اس سے زیادہ وسیع ہے اور شمال میں یہ آگرہ مین پوری اور ایٹہ تک بولی جاتی ہے ۔ اس کے مشرق میں پوربی ہندی کی بگھیلی بولی ہے ۔ شمال اور شمال مغرب میں یہ قنوجی اور برج بھاشا سے گھِری ہوئی ہے ۔ اس کے جنوب مغرب میں راجستھانی کی بولیاں رائج ہیں ۔ جنوب میں اس کے حدود مراٹھی سے ملتے ہیں ۔ بجز جنوب کے یہ ہر سمت میں ہم سایہ بولیوں سے گھُل مِل کر درمیانی بولیاں بنا دیتی ہے ۔ بندیلی بولی میں غیر معمولی یکسانیت مِلتی ہے ۔ اس میں ادب کا بھی وقیع سرمایہ ملتا ہے ۔ آلہا اُودل کے قصّوں سے متعلق جو گیت آج دیہاتی ہندوستان کی رگوں میں خون کی رفتار تیز کردیتے ہیں اِسی بولی میں پہلے پہل لکھے گئے تھے ۔ ان کے علاوہ ہندی ادب کے نورتن شاعر اور تنقید نگار کیشوداس اور پدما کرکا بھی تعلق اسی بولی سے ہے ۔

بندیلی میں تلفظ کی بعض اپنی خصوصیات ہیں ۔ اس میں حروف (اِے) اور (اُو) چھوٹے ہوکر (اِ)اور (اُو) بن جاتے ہیں ۔ مثلاً بیٹی سے بیٹا (بیٹیاّ نہیں)، اور گھوڑے سے گھروا (گھوروا نہیں) جو کہ مشرقی زبانوں کی نمایاں خصوصیت ہے دوسرے حروفِ علّت (آئ) عموماً (اے) میں اور(اُم) عموماً (اُو) میں تبدیل ہوجاتا ہے اور یہی تلفّظ عام طور سے ملتا ہے ۔ بیٹھنا ۔ کِینا (کہنا) ۔ تیرنا ۔ ہے ۔ پیسہ ۔ کیسا ۔ میں ۔ روزمرہ کے استعمال میں آتے ہیں ۔

حروفِ صحیح میں برج کی طرح (ڑ) عموماً میں تبدیل ہوجاتی ہے ۔ " پَرو" دَور کے " "گھردا " ۔ لیکن تلفظ کی سب سے نمایاں خصوصیات یہ ہے کہ (ہ) ہمیشہ گرادی جاتی ہے ۔ مثلاً کئی بجائے کہی کے ، او بجائے آہو ۔ ۔ ۔ بھوپالی اُردو میں ، تلفظ کی یہ جھلک برابر ملتی ہے ۔ ایک لفظ جو اس علاقہ میں ہر جگہ مستعمل ہے ۔ بہت کی بجائے بھوت ہے ۔ قدیم دکنی میں یہ " بھوت " ہمیشہ اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے ۔ بندیلی میں بیٹا ، گھروا ، بلی وا اور چِری واقسم کے الفاظ کثرت سے مِلتے ہیں ۔

قنوّجی

مغربی ہندی کی اِس بولی کا نام شہر قنوّج کے نام پر ہے ، جو ضلع فرخ آباد میں ہے ۔ قنوّج کا شمار ہندوستان کے قدیم ترین شہرووں میں ہوتا ہے ۔ سنسکرت کے پُرانے ادب حتّٰی کہ رامائن تک میں اس کا ذکر ملتا ہے ۔ سنہ ۵۰۰ ء کے وسط میں یہ راٹھور راجپوتوں کے قبضہ میں آگیا ۔ سنہ ۱۱۹۳ ء میں اس خاندان کے آخری راجہ جے چند کی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھوں تباہ ہوتی ہے ۔ اِس عہد کے ادب کے نمونے ابھی تک نہیں ملے ہیں ۔ اِس لیئے قدیم قنوّجی کی اہمیت کا پورا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ۔

آج کل قنوّجی اپنی خالص شکل میں ایٹہ ، فرخ آباد، شاہجہاں پور کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ یہ کانپور ہردوئی تک پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن کان پور میں یہ بندیلی بولی سے اور ہر دوئی میں اودھی سے متاثر نظر آتی ہے۔ شاہجہاں پور کے شمال میں یہ پیلی بھیت تک بولی جاتی ہے جہاں یہ برج بھاشا سے گھُل مِل جاتی ہے۔ اس کے مغرب اور شمال مغرب میں برج بھاشا اور جنوب میں بندیلی ہے۔ مشرق اورشمال مشرق میں یہ پوری ہندی کی اودھی بولی سے گھِری ہوئی ہے۔ اس کا رقبہ چونکہ محدود ہے اس لیے اِس کی قسمیں نہیں مِلتیں۔ البتہ کان پور اور ہردوئی کے اضلاع میں یہ مِلواں شکل میں بولی جاتی ہے۔ کانپور میں جو لفظ حروفِ صحیح پر ختم ہوتا ہے اس کے آخر میں عموماً (ی) لگادیتے ہیں۔ فارسی ، عربی کے الفاظ تک اس قسم کی تبدیلیوں سے نہیں بچتے۔ مثلاً بعدی (بعد) دوری (دور)۔

ادبی حیثیت سے یہ برج کی وجہ سے پیچھے رہ گئی ہے۔ اس کی اور برج بھاشا کی قواعد میں فرق بھی اِتنا کم ہے کہ گریرسن کو ا سے علیٰحدہ بولی کی حیثیت دینے میں پس و پیش ہے۔ اس نے ا سے علیٰحدہ حیثیت شہر قنوج کی تاریخی قدامت کی وجہ سے دی ہے۔ ورنہ لسانی اعتبار سے ا سے برج بھاشا کی ذیلی بولی کہا جاسکتا ہے۔ اس کی قواعد کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں برج بھاشا کے برخلاف (اَو) کی بجائے (اُو) پر ختم ہوتا ہے لیکن یہ (اُو) برج بھاشا کی بعض بولیوں میں بھی مِلتا ہے۔ برج اور قنوجی دونوں میں حروف صحیح پر ختم ہونے والے الفاظ کے آخر میں (وا) بڑھادیا جاتا ہے۔ جیسے ہندوستانی گھر، قنوجی گھر اور گھروا ۔ دوسری ہمسایہ بولیوں کی طرح قنوجی میں بھی حرفِ علّت کے درمیان کی (ہ) گِرجاتی ہے۔ جیسے کہی ہو کی بجائے "کئی او"۔

ہریانوی ، بانگڑو یا جاٹو

دہلی کے شمال مغربی اضلاع کرنال، رہتک ، حصار وغیرہ کی بولی ان تینوں ناموں سے پُکاری جاتی ہے لیکن اس کا ہر یانوی نام زیادہ موزوں ہے۔ ہریانہ مسلمانی عہد سے بھی قبل کا نام ہے۔ دہلی میں یہ زبان جاٹو کے نام مشہور ہے۔ کیونکہ آس پاس کے علاقہ میں جاٹوں کی آبادی کثرت سے ہے۔ جمنا کے شمال مغربی کنارے پر اس کا اتصال مغربی ہندی کی اک دوسری بولی (گریرسن کی ہندوستانی) سے ہوجاتا ہے۔ گریرسن موجودہ ہریانوی کو کھڑی بولی (ہندوستانی) ہی کی ایک شکل مانتا ہے۔ جس میں راجستھانی اور پنجابی بولیوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ حالانکہ آگے چل کر پنجابی کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ پنجابی ایک مخلوط زبان ہے جو پرانی لہندا اور دو آبہ کی زبان کے اختلاط سے قدیم زمانے میں بنی ہوگی ۔ ان بیانات کے تضاد پر تفصیلی تنقید کسی اگلے باب میں کی جائے گی۔ در اصل گریرسن کے پیشِ نظر شمالی ہند کی اُردو کے قدیم نمونے نہ تھے۔ اس لیے وہ ہریانی کی قدامت کے متعلق صحیح نتائج اخذ نہ کرسکا۔

اس کے برعکس ڈاکٹر رام بِلاس شرما کا خیال ہے کہ کھڑی بولی کے شمال مغربی علا قے کی عوامی زبان علیٰحدہ حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ہریانوی ہی کا ایک رُوپ ہے ۔ یہ علاقہ میرٹھ ، مظفر نگراور سہانپور کے اضلا ع پر مشتمل ہے۔ یہاں کے عوام کی زبان ادبی ہندی اردو سے کافی مختلف ہے ۔ مثلاً ن ڑ (ला)اس کی ہر یانوی کے ساتھ مشترک خصوصیت ہے، لیکن کم از کم اُردو میں اس کا استعمال کسی زمانے میں بھی نہیں ہوا ہے۔ اس قسم کے اختلافات صرف صوتیات تک محدود نہیں ، صرف و نحو کی سطح پر بھی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے بار بار جو، میرٹھ اور، میرٹھی، کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں ۔ دہلی اور دو آبے کے دوسرے شہروں اور قصبات میں زبان کی جو میعار بندی ہوئی ہے اس میں بعد کے بہت سے لسانی عوامل کارفرما رہے ہیں جن کا تفصیلی ذکر اردو زبان کا ارتقا بیان کرتے وقت کیا جائے گا۔

ہر یانہ میں نو مسلموں کی آبادی قدیم زمانے سے پائی جاتی ہے بلکہ سلطنتِ مغلیہ کے عہد تک تو یہاں ان کی کثرت تھی ۔ سلاطینِ دہلی کے لشکروں میں بھرتی عام طور سے اسی علاقہ کے جنگجو قبائل سے کی جاتی تھی ۔ اِس علاقہ کے کئی قصبات ہانسی ۔ نارنول ، جھجر وغیرہ کو سیاسی اعتبار سے مختلف زمانوں میں ہمیت حاصل رہی ہے ۔ دہلی کے سیاسی انقلابات کا سب سے گہرا اثر بھی اسی علاقہ پر پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقہ کی زبان میں کافی اُلٹ پھیر ہوتے رہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر بعض اوقات کھڑی بولی کے افعال استعمال کیے جاتے ہیں تو کبھی کبھی پنجابی کے بھی ۔ کرتا اور کہتا کے ساتھ ساتھ کردا کہندا بھی مستعمل ہیں ۔ کھڑی کا "وہ جاوے ہے " بھی سُنائی دیتا ہے ۔ اور"وہ جا سے " بھی جنوب سے ہریانی پر برج بھاشا اور راجستھانی کی بولی میواتی بھی اثرانداز ہوتی رہی ہیں ۔ شہر دہلی اتفاق سے ان تمام بولیوں کے سنگم پر واقع ہے اس لیے زبان کا معیار عرصہ تک متعین نہیں ہوسکا ۔البتہ میرعبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات ہندی کی تصنیف کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہانسی کے نواح کی ہریانی بولی معیاری مانی جانے لگی تھی، جو جمنا پار کی میرٹھ ضلع کی کھڑی بولی (ہندوستانی) سے بہت زیادہ مماثلت رکھتی تھی لیکن خان آرزو تصحیح غرائب اللغاتِ ہندی میں میر عبدالواسع سے اختلاف کرتے ہوئے ہریانوی کے بجائے سند ہمیشہ برج بھاشا سے (گوالیری " افصح السنۂ ہند") سے لیتے ہیں ۔ "زبان اہلِ اردو " زبان اردوئے شاہی " با بزبان اُردو" (اقتباسات خان آرزو کے ہیں) کو بھی وہ بہت معیاری نہیں مانتے ۔

کھڑی بولی یا ہندوستانی

پچھلے صفحاف میں شمالی ہندوستان کی آریائی زبانوں کی سلسلہ وار تاریخ بیان کرتے ہوئے ہم بتاتے آئے ہیں کہ کس طرح ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ اَپْ بَھرنش ہی کے اندر جدید آریائی زبانوں کے رُوپ جھلکنے لگے تھے ۔ اس عہد کے شَورسیْن دیس (متھرا کے ارد گرد کا علاقہ) کی اَپْ بَھرنش (شورسینی اَ پْ بھرنش) کو ادبی حیثیت سے

بہت فروغ تھا جس کا ڈنکا بنگال سے پنجاب تک بج رہا تھا۔ چنانچہ قدیم بنگالی ادب تک میں اس کی جھلک ملتی ہے اِسی شورسینی اَپ بھرنش نے مغربی ہندی کو جنم دیا جو ۱۰۰۰ء کے قریب ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے ۔ جب کوئی زبان کسی وسیع علاقہ میں بولی جاتی ہے تو اس کی یکسانیت باقی نہیں رہتی اور وہ جزوی اختلافات کے ساتھ کئی بولیوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ مغربی ہندی بھی کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ پانچ ایسی ہی بولیوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔

(۱)بندیلی (۲) ہریانوی یا بانگڑو(۳) برج بھاشا (جس میں قنوجی بھی شامل ہے) اور (۴) کھڑی بولی یا جسے گریرسن " ہندوستانی "کا جدید نام دیتا ہے۔

مغربی ہندی کی وہ بولی جو مغربی روہیلکھنڈ دو آبہ کے شمالی حصّہ اور پنجاب کے ضلع انبالہ میں بولی جاتی ہے، گریرسن ا سے ہندوستانی کہہ کر پکارتا ہے۔ اس میں اور ادبی ہندوستانی (اردو) میں ماں بیٹی کا تعلق ہونے کے باوجود بیرونی اثرات کی وجہ سے بعض اختلافات پائے جاتے ہیں ۔ عام طور سے بولی ہندوستانی میں ایک ہی مفہوم کے لیے کئی کئی محاورے پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک کو ادبی سندمل گئی اور دوسرا مردود متروک سمجھا جانے لگا ۔ قطع نظر ادبی ہندوستانی اِس بولی ہندوستانی کے اندر بھی برج بھاشا اور دیگر بولیوں کی طرح بہت سے عربی، فارسی الفاظ اس طرح گھُل مل گئے ہیں کہ وہ اس کا جزوِ بدن معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً مظفر نگر کے دیہات کا باشندہ ماں کے عام فہم لفظ کی بجائے عربی کے لفظ " والدہ" کو بگاڑ کر "مالدہ" کہے گا۔ اِس طرح "محافظت"کو " مہو جت " انتقال کو محض "کال " اور مطلب کو "مطبل " وغیرہ۔

ہندوستانی بولی کے حدو داربعہ کی تفصیل یوں ہے ۔ گنگا کے پورب میں مرادآباد ، بجنور ، رام پور کے اضلاع یعنی مغربی روہیلکھنڈ ۔ ان مقامات کی بولی ادبی ہندوستانی سے قریب ترین ہے ۔ اس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ ان مقامات میں مسلمانوں کی تعداد کثیر ہے اور ان کے تمدّن کا گہرا اثر رہا ہے ۔ گنگا کے دوسری طرف یہ میرٹھ ، مظفرنگر، سہارن پور کے اضلاع اور دہرا دون کے میدانی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ ضلع دہرہ دون کے پہاڑی علاقوں میں پہاڑی زبان رائج ہے ۔ دو آبہ کے بالائی حصّہ کی بولی بھی ادبی ہندوستانی (اردو) سے بہت مِلتی جلتی ہے ۔ لیکن اس قدر نہیں جتنی مغربی روہیلکھنڈ وغیرہ کے اضلاع کی ۔ یہاں کی زبان میں بہت سی ایسی شکلیں رائج ہیں جو مرادآباد ، بجنور اور رام پور کے اضلاع میں متروک سمجھی جاتی ہے، جمنا پار کرکے پنجاب میں داخل ہوں تو جنوب سے شمال کی طرف جو اضلاع ملتے ہیں حسب ذیل ہیں :۔ دہلی ، کرنال ، انبالہ ، دہلی (قطع نظر شہر دہلی) اور کرنال کے اضلاع کی زبان ہندوستانی نہیں ہے ۔ یہاں مغربی ہندی کی ایک دوسری بولی جس کا نام ہریانوی بانگڑو یا جاٹو ہے بولی جاتی ہے ۔ اس پر راجستھانی اور پنجابی کی گہری چھاپ نظر آتی ہے ۔ ضلع انبالہ تک پہونچتے پہونچتے راجستھانی کے اثرات زائل ہوجاتے ہیں ۔ چنانچہ ضلع انبالہ کی مشرقی کالیا اور پٹیالہ کی بعض

تحصیلوں کی زبان ہندوستانی ہے جو پنجابی سے بہت زیادہ متاثّر نظر آتی ہے ۔ مغربی انبالہ کی زبان تو بالکل ہی پنجابی ہے۔ اس علاقہ میں ہندوستانی اور پنجابی کے درمیان دریائے گھگھر کو خطِ فاصل قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ ظاہر ہوچکا ہے کہ کھڑی بولی یا ہندوستانی مغربی ہندی کے شمال مغربی علاقہ کی بولی ہے۔ اس کے مغرب میں پنجابی یا دلّی اور کرنال کی آدھی راجستھانی مِلی ہوئی بانگڑو یا جاٹو زبان ہے۔ اِس کے شما ل میں پہاڑی بولیاں ہیں جن کا راجستھانی سے گہرا رشتہ ہے ۔ جنوب اور مشرق میں یہ برج بھاشا سے گِھری ہوئی ہے ۔ چنانچہ گریرسن نے ا سے برج بھاشا کا ایسا رُوپ مانا ہے جو پنجابی میں بتدریج ضم ہوتا چلا گیا ہے ۔ یہاں بظاہر گریرسن کی تحقیقات میں تضاد نظر آتا ہے ۔ اِس سے قبل وہ تقسیمِ زبان کے سلسلہ میں پنجابی کو بیرونی اور اندرونی زبانوں (لہندا)اور (مغربی ہندی) کی آمیزش کا نتیجہ بتاتا ہے ۔ اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ کسی زمانے میں مغربی ہندی کی شمال مغربی شا خ (کھڑی بولی اور ہریانوی کی قدیم شکل نے) لہندا کو لاہور تک پیچھے ڈھکیل دیا تھا ۔ چنانچہ اندرونی زبانوں کے اثرات جوں جوں ہم مغرب کی طرف جا تے ہیں ، ہلکے ہو تے چلے جا تے ہیں ، اِس درمیانی زبان یعنی پنجابی نے مسلمانوں کی فتوحات کے وقت مدھیہ دیش کی بولیوں (ہریانوں اور کھڑی) پر اثر انداز ہوئی ۔ اس طرح مغربی ہندی کی وہی پرانی خصوصیات جو کبھی لہندا کی سرزمین میں کھپ گئی تھیں مغربی ہندی کی ان بولیوں کو پھر واپس مِل جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی قواعد کا وہ حصّہ جسے پروفیسر شیرانی پنجابی کا اپنا بتا تے ہیں(جس کی تفصیلی بحث آگے کی گئی ہے) وہ دراصل براہ راست مغربی ہندی کی قدیم شکل (شورسینی اَپْ بھرنش) سے ماخوذ ہے ۔ ادبی ہندوستان (اردو) اور بولی ہندوستانی میں بعض تلفّظ کے بھی اختلاف پا ئے جا تے ہیں ۔ حروف صحیح (مصمتوں میں بولی ہندوستانی میں پنجابی، راجستھانی اور ہریانوی کی طرح مخی (ن) اور (ل) کا استعمال آزادی سے پایا جاتا ہے ، جو اُردو کی طرح مغربی ہندی کی دیگر بولیوں برج وغیرہ میں بھی نہیں ملتا۔ اِس کے علاوہ جمع میں حالتِ مفعولی کا اختتام اردو کے برخلاف اکثر (اں) پر ہوتا ہے جیسے دناں ، عورتاں وغیرہ ۔ یہ شکل ہریانی ، راجستھانی اور پنجابی میں عام ہے ، دکنی کی بھی یہ خصوصیت ہے لیکن اُردو اور برج بھاشا میں نہیں ملتی ۔ افعال میں اسی طرح حال میں " مارتا ہوں " کے ساتھ میں " ماروں ہوں " بھی ملتا ہے ۔ میں ماروں ہوں ، وہ مارے ہے ، یہ شکلیں راجستھانی اور ہریانی زبانوں میں بھی ملتی ہیں اور قدیم اردو (میؔر و سوداؔ بلکہ غالبؔ اور ذوقؔ تک) فعل کی یہ شکلیں مِل جاتی ہیں ۔ آ ج بھی بجنور ، مراد آباد وغیرہ کے اضلا ع اور دہلی میں اسی طرح بولی جاتی ہیں۔ لیکن جدید اُردو نثر میں متروک ہوگئی ہیں گو شعر میں ان کا روا ج اب تک جائز مانا گیا ہے۔

ہندوستانی کے بارے میں گریرسن اور لائل دونوں کی را ئے یہی ہے کہ بولی ہندوستانی کا ڈول اور کینڈا دیگر بولیوں کی بہ نسبت برج سے زیادہ قریب ہے ۔ بولی کے اعتبار سے اس کی علیٰحدہ حیثیت ہے ۔ بعض نجی خصوصیات کی وجہ سے ہم ا سے برج میں ضم نہیں کرسکتے۔ یہ قدیم زمانے سے دلیّ اور اس کے آس پاس کی زبان

ہے ۔ قدیم سیاسی جغرافیہ میں کرُدُراج کی زبان تھی ۔ اب چاہے اسے دہلوی کھڑی بولی یا ہندوستانی کسی بھی نام سے یاد کیا جائے ۔ اس کا علاقہ اور اس کی قدامت متعین کی جاسکتی ہے ، اِس کی شناخت اَپْ بھرنش عہد کے ادب میں بھی کی جاسکتی ہے ۔ لیکن چونکہ اردو زبان کے ارتقا کا براہ راست اس سے تعلق نہیں اِس لیے اردو ارتقا کی داستان دکن سے شروع کریں گے جہاں پندرھویں صدی عیسوی کے وسط سے اس کے تحریری ادب کے نمونے ملتے ہیں ۔ شمال میں اکبر اور جہانگیر کے عہد سے پہلے کے نمونے زیادہ معتبر نہیں ، اس لیے امیر خسرو اور صوفیائے کرام کے تبّرکات لسانی تجزیے کے لیے غیر اہم قرار پائیں گے۔

○○○

تیسرا باب

اُردو زبان کا ارتقا

شمالی ہند میں اُردو

(۱۲۰۰ تا ۱۷۰۰ء)

لسانی پس منظر

اردو زبان کی تاریخ وسیع تر معنوں میں ہند آریائی زبان کی تاریخ ہے، جسے قدیم ہند آریائی ، وسطی ہند آریائی اور جدید ہند آریائی کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کا زمانہ ۱۵۰۰ ء ق ۔ م سے لے کر ۱۰۰۰ء تک پھیلا ہوا ہے جب ہندوستان کی جدید ہند آریائی زبانیں لسانی ارتقا کے عمل میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ جیسا کہ پچھلے باب میں مذکور ہوچکا ہے اُردو کا سلسلہ کھڑی بولی کے توسط سے شورَسینی اَپْ بھرنش سے ملتا ہے جو ۱۰۰۰ء کے قریب مدھیہ دیش (انبالہ تا الہ آباد اور دہرہ دون تا اجین کا علاقہ) کی سب سے مستند زبان تھی۔ اس لئے ہند آریائی کے محققین نے اردو کے کھڑی بولی روپ کی نشان دہی کا سلسلہ اَپْ بھرنش کی ادبیات سے کیا ہے ۔ بقول چندر شرما گُلیری " پرانی اَپْ بھرنش سنسکرت اور پراکرت سے ملتی جلتی ہے اور بعد کی قدیم ہندوستانی سے جس طرح اس زمانے میں لفظ گاتھا ، سے مراد پراکرت ہوتی تھی اُسی طرح ، دوہا ، سے اَپْ بھرنش ملی ہوئی رائج الوقت زبان کا مفہوم لیا جاتا تھا جس کی ادبیات کے نمونے ۸۰۰ ء سے ملنا شروع ہوجاتے ہیں۔" اس عہد کی زبان کا مطالعہ حسبِ ذیل تصانیف پر مبنی ہے۔

(۱) وِجے پال راسو (۲) ہمیرراسو

(۳) کیرتی لتا (۴) کیرتی پتاکا

قدیم ہندوستانی کے مطالعے کے لئے ذیل کی کتب مستند خیال کی جاتی ہیں:

(۱) کھومان راسو (۲) بسیل دیوارسو (۳) پرتھوی راج راسو (۴) جے چندر پرکاش (۵) پرمال راسو (آلھا کی اصل شکل) (۶) ودیا پتی پداولی

مذکورہ بالاکتب کے علاوہ ادب کا بہت بڑا ذخیرہ بُدھ سِدّھوں اور گورکھ پنتھی جوگیوں سے منسوب ہے جو ملک کے مشرقی اور مغربی حصّوں میں اپنے مذہبی گورکھ دھندے کا پرچار عوامی زبان میں کیا کرتے تھے ۔ لسانیاتی اعتبار سے یہ زیادہ مستند نہیں تاہم ان کی " سُدھکڑّی بھاشا " کا مطالعہ اس عہد کی بہت سی لسانی گتھیوں کا حل پیش کرتا ہے۔

بُدھ سِدھّوں اور ناتھ پنتھیوں کے دو ہوں میں قدیم اردو کے ماضی کی شکلیں مل جاتی ہیں ۔ مثلاً کہیا ، پوچھیا ، ماریا ، بوجھیا۔ حروف میں جو، سو، جاب ، (جب تک) ، تاب (تب تک) عام مستعمل تھے۔

اس عہد کی سب سے اہم تصنیف ہیم چندر (۱۱۷۲ ۔ ۱۰۸۸ ء) کی قواعد " ہیم چندر شبدانوشاسن " ہے جس میں ایک دو ہا نقل ملتا ہے۔ ایک راجپوت عورت اپنے شوہر کے مارے جانے کا ذکر اس فخریہ انداز میں اپنی سہیلیوں سے کرتی ہے۔

بَھلاّ ہوا جو ماریا بہنی مہارا کَنْتُ
لجّے جَم تو واسّیا ہو، جَئے بھگاّ گھر واَنتُ

(بھلا ہوا بہن ! جو میرا کَنْتُ (پیارا ، شوہر) مارا گیا ، جو بھاگا ہوا گھر آتا تو ہم عمر سہیلیوں میں مجھے لا ج آتی) اس دو ہے کا پورا کینڈا قدیم کھڑی کا ہے ، جس کی قواعد کی کئی شکلیں اس میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اسی عہد کی دوسری اہم تصنیف جینی عالم میروتنگ کی " پربند چنتا منی " ہے جس میں راجہ منج کا یہ دوہا درج ہے :

بانہہ بچھوڑدی جاہی تو ہوں ، ہوؤں تے دیں کا دوس
ہیا ٹھیے جئ نیس د ہی جا نو ئی منجؔ سر و س

برج بھاشا کا اسی مفہوم کا دوہا زبان زدِ خلائق ہے :

با نہہ چھڑا ئے جا ت ہو جا ن کر بِنلَ مو ئے
ہر دئے میں سے جاؤگے تو مرد بدھوں گی توئے

ہمیر راسو کا مصنف سا رنگ دھر ۱۳۱۴ ء کے قریب یہ رزمیہ الفاظ لکھتا ہے :

ڈھولا ماریا ڈھلّی مَنہ مُچھیو میچھ سر یر
(دلیّ میں ڈھول بجایا اور ملچھوں (مسلمانوں) کے سریر(جسم) بے ہوش ہو گئےُ)

اَپْ بھرنش کی سب سے بڑی خصوصیت ، جو بعد کو جدید ہند آریائی زبانوں نے بھی اپنائی ، یہ تھی کہ اس میں سنسکرت کے تَت سَم (خالص) الفاظ بہت کم استعمال ہو تے تھے مسلمانوں کی آمد نے سنسکرت کے فسوں کو اور کم کردیا ۔ اَپْ بھرنش کی تصانیف کے بعد ہندی ادب کا وہ دور آتا ہے جس" ویر گاتھا کال" (رزمیہ

عہد)کہاجاتا ہے اس عہد کی طویل رزمیہ نظموں کو " راسو" کہا جاتا ہے.................... ہندی ادبیات کے اس دور میں (۷۰۰ تا ۱۱۵ ء) ہمیں اٹھارہ شاعروں کے نام ملتے ہیں جن میں اکرامؔ ، فیضؔ، نرپتی نالا، چند بردائی مدھو کر ، شری دھر اور شاعرہ مکتابائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ اس عہد کی زبان کے مطالعہ کے لئے سب سے مستند مواد نرپتی نالا کا بیسل دیوار سواور چند بردائی پرتھوی را ج راسو ہے ۔ نر پتی نالا کا ممدوح اجمیر کا چوہان راجہ وگرہ را ج چہارم (۱۰۰۱ ء) عرف بیسل دیو ہے ۔ اس راسو کی زبان قدیم راجستھانی ہے لیکن اس میں عربی فارسی کے عام بول چال کے الفاظ جیسے محل، انعام ، ینجا (نیزہ) ، تاجنو (تازیانہ) وغیرہ در آئے ہیں۔لیکن ہندی کے سب سے پہلے اور بڑے شاعرہونے کا فخر چند بردائی (۱۱۹۲۔ ۱۱۵۹ ء) کو حاصل ہے جسکی مشہور ومعروف تصنیف پرتھوی را ج راسو ہے ۔ لیکن (۱۱۹۲ ۔ ۱۱۵۹ء) کو حاصل ہے جس کی مشہورو معروف تصنیف پرتھوی را ج راسو ہے ۔ وہ دہلی کے آخری ہندوراجہ، پرتھوی را ج کا دوست ، وزیراور درباری شاعر تھا ۔ پرتھوی را ج راسو ڈھائی ہزار صفحے کی ضخیم کتاب ہے جس کے اکثر حصص کے مستند ہو نے کے بارے میں محقیقن میں اختلاف رائے ہے ۔ محمود شیرانی ، شیامل داس جی کی رائے کی تائید کرتے ہوئے ا سے ایک جعلی اور بعد کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔

پرتھوی را ج اور اس کی بہن پرتھابائی سے منسوب " دان پتر "کی زبان حیرت ناک طریقے پر کھڑی بولی سے قریب ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر سمبت درج ہونے کے باوجود پنڈت اوجھا اور محمود شیرانی دونوں انہیں بھی جعلی قرار دیتے ہیں ۔ ان میں کھڑی کے ماضی کی علامت (اَ) اور مستقبل کی (گ)ملتی ہیں : ہووے گا، دیوے گا ، کرے گا ، آویں گے ، جیسے جدید افعال موجود ہیں ۔ ہندوستان کے لفظ کا تلفظ " ہندوستھان " (ہندو + استھان) لکھا ملتا ہے ۔ ضمائر میں تُم کے بجائے تَم ہے جو آ ج بھی کھڑی کے علا قے میں عام ہے ۔ عربی فارسی کے الفاظ شامل ہیں جیسے ، دوا ، کھجانہ (خزانہ) ، پرچہ ، آرام ،کھرچہ (خرچہ) ماف (معاف) ، کھاتر (خاطر) حرام کھوری (حرام خوری) ، تکھت (تخت) ، ہک (حق) ثابت ، اولاد ، کھالس (خالص) ، روکا (رقعہ) ، ہاجر (حاضر) ، ہجور (حضور)کاگد (کاغذ) حکم ، تاکید ، آرامن (آرام)۔

اُردو کا آغاز:

محمد بن قاسم کی قیادت میں عرب مسلمان ۷۱۲ ء میں عربی بولتے ہوئے ہوئے سندھ میں داخل ہو تے ہیں اور جدید سندھی کو جنم دیتے ہیں جس کا رسمِ خط ہی عربی نہیں بلکہ جس میں عربی کے ہزاروں الفاظ مدغم ہوچکے ہیں۔ تاہم سید سلیمان ندوی کا یہ خیال کہ اردو کا ہیولیٰ سندھ میں تیار ہوا تھا لسانیات کی رو سے صحیح نہیں۔ ہندوستان کی زبانوں میں عربی فارسی الفاظ کا داخلہ ہی اردو کی تخلیق کی ضمانت نہیں کرتا ، بلکہ جب یہ لسانی اثرات

" زبانِ دہلی و پیرامنش " میں نفوذ کرتے ہیں تب اردو کا پہلا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے ۔ اور یہ ہوتا ہے مسلمانوں کی فتح دہلی (۱۱۹۳ء) کے بعد ۔ اس سے قبل مسلمان پنجاب اور لاہور میں حکمراں کی حیثیت سے دوبرس تک متمکن رہ چکے تھے ۔ محمود غزنوی کی ۱۰۰۰ء میں فتوحاتِ پنجاب کے بعد اس کا الحاق سلطنت غزنہ سے کرلیا جاتا ہے اور لاہور کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے ۔ لاہور کی اِسی "پنجابی ۔ ترکی ۔ فارسی " ادبی فضا میں مسعود سعد سلمان (م ۱۱۲۵ اور ۱۱۳۰ء کے درمیان) کا ظہور ہوتا ہے جن کے ترکی اور فارسی کے قادرالکلام شاعر ہونے کے علاوہ "ہندی" کے صاحبِ دیوان ہونے کی شہادت حضرت امیر خسرو نے " غرۃ الکمال " کے دیبا چے میں ان الفاظ میں دی ہے :

" پیش از یں از شاہانِ سخن کسے راسہ دیوان نہ بودہ مگر مرا کہ خسروِ مالک کلا مے۔ خواجہ مسعود سعد سلمان را اگرہست امّا آں سہ دیوان درعبارت عربی و فاری وہند وی است ۔ درپارسئ مجرد کسے سخن راسہ قسم نہ کردہ جزمن کہ دریں کار قسّام و عادلم "

اس کے بعد عونیؔ صاحبِ لب الالباب نے بھی تصدیق کی ہے :

" اوراسہ دیوان ست ، یکے بہ تازی ، یکے بہ پارسی دیکے بہ ہندوی "

چنانچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مسعود سعد سلمان کسی " ہندوی" زبان میں بھی شاعری کرتے تھے اور شاید ان کا دیوان امیر خسرو کے زمانے تک (م ۱۳۲۵ء) دستیاب تھا ۔ لیکن نمونے کے عدم موجودگی میں یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ یہ " ہندوی "کون سی زبان تھی ۔ ہمارے خیال میں یہ یقیناً امیر خسرو اور ابوالفضل کی تقسیم السنۂ ہند کے مطابق " لاہوری " (پنجابی) ہوگی جو دونوں کی فہرست کی زبانِ دہلی سے یقیناً مختلف ہوگی اس لئے کہ "ہندوی" کا اطلاق فارسی کے علی الرغم شمالی ہند کی اکثر ہندوستانی زبانوں کے لیے مسلسل استعمال ہوتا رہا ہے ۔

پنجاب پر غوریوں کے حملے ۱۱۶۸ء سے شروع ہوجاتے ہیں۔ ۱۱۹۳ء میں بلآخر ایک شکست کھانے کے بعد شہاب الدین غوری دہلی کے آخری ہندو سمراٹ پرتھوی راج کو شکست فاش سے کر دہلی اور اجمیر پر قابض ہوجاتا ہے، جہاں اس کا سپہ سالار قطب الدین ایبک ، اس کے انتقال کے بعد ۱۲۰۶ء میں سلطنت غلاماں کی داغ بیل ڈالتا ہے ۔ اردو کی ابتدا اور ارتقا کی اصل تاریخ اس کے بعد ہی سے شروع ہوتی ہے ۔

" دہلی وپیرامنش "کی زبان کے پہلے شاعرامیر خسرو ہیں (۱۳۲۵ ۔ ۱۲۵۳ ء) جنھوں نے اپنی مثنوی "نُہ سپہر" میں ہندوستان کی بارہ زبانوں کے نام گنائے ہیں ۔ ان میں ایک " لاہوری " اور دوسری " زبانِ دہلی و

پیرامنش" ہے۔

امیر خسرو کا " ہندوی "کا شاعر ہونا مسلّم ہے، اس لیے کہ انھوں نے خود اعتراف کیا ہے :

" جزوے چند نظم ہندوی نیز نذر دوستاں کردہ شدہ است۔
اینجا ہم بذکرے بس کردم و نظر برآں داشتم کہ لفظِ ہندوی درپارسی
لطیف آوردن چنداں لطفے نرارد مگر بضرورت۔ آنجا کہ ضرورت
بودہ است آوردہ شد"

لیکن وہ اپنے ہندی کلام کو خود بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے، صرف تفنّنِ طبع کے لئے اس میں کہتے تھے اور دوستوں میں تقسیم کردیتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن سے منسوب ریختوں، پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کی کوئی "مخطوطاتی " بنیاد نہیں ہے ۔ ان کی زبان بھی چودھویں صدی کی اردو کے مقابلے میں (جن کی جھلکیاں بعض اوقات فقروں اور الفاظ کی شکل میں صوفیاء کے ملفوظات میں مل جاتی ہیں) خاصی جدید ہے ۔ ان میں سے کچھ ٹھیٹھ کھڑی بولی میں ہیں، کچھ خالص برج بھاشا میں اور کچھ دونوں بولیوں کی آمیزش لیے ہوئے زبان میں ان میں سے بعض پہلیاں نہ صرف لسانی .... بلکہ تاریخی نقطہ نظر سے بھی غلط ثابت کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً حقّے والی پہیلی ہی کو لے لیجئے۔

گاگر تیری جل بھری، سر پر لاگی آگ
باجن لاگی بانسری ، نکسن لاگی آگ

شمالی ہند میں تمباکو کا رواج عہد اکبری میں ہوا ۔ ہندوستان میں اس کا سب سے پہلے رواج دکن کے عادل شاہی دربار میں ہوا۔ وہاں سے مغل سفیر حقّہ اورر تمباکو کا تحفہ لے کر آگرہ آیا تھا جہاں اس کا شوق شاہی دربار اور امراء کے طبقے میں آناً فاناً پھیل گیا۔ خانِ آرزو نے نوادرالالفاظ (۱۷۵۱ء) میں لکھا ہے :

" تنباکو بقول صاحب مآثررحیمی درہندوستان ازعہد اکبرشاہ رواج
یافتہ ۔ اوّل از فرنگ بہ دکن آمدہ بو دو بعد ازاں بہ ہندوستان رواج
گرفت "

یہی صورت ان سے منسوب " خالق باری" کی ہے جسے مدلّل طریقے پر لسانی اور تاریخی اعتبار سے محمود شیرانی نے رد کرکے اس کا انتساب عہد جہاں گیری کے ایک مصنف ضیاء الدین خسرو سے کیا ہے، حالاں کہ خان آرزو کی نوادر الالفاظ میں (۱۷۵۱ء)اس کا حوالہ ایک سے زائد بار " رسالہ منظومۂ امیر خسرو " کے نام سے ملتا ہے۔

خسرو کی ہندی شاعری کی "مخطوطاتی" بنیاد رکھنے والی پہلی سند ہمیں وجہی کی، سب رس، (۱۶۳۵ء)

میں ملتی ہے وجہی نے ان سے منسوب یہ ،دوہرہ ، نقل کیا ہے۔

پنکھا ہوکر میں ڈلّی ساتی تیرا چاؤ

مُنّجہ چلتے جنم گیا تیرے لیکھن باؤ

(اے دوست تیری محبت میں میں پنکھا بن کر ڈولتی رہی ہوں۔

مجھے اس طرح چلتے (اور) تیرے لیے (لیکھن) ہوا کرتے ایک

جنم ہوگیا ہے)

اس کے بعد میر تقی میر کے تذکرہ نکات الشعر (۱۷۵۲ء) میں امیر خسرو سے منسوب یہ ریختہ ملتا ہے :

زرگرے پسرے چو ماہ پارا

کچھ گھڑئیے ، سنوّارئے پکارا

نقدِ دلِ من گرفت وبشکست

پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوّارا

امیر خسرو وہی سے متعلق زمانے میں ہمیں بعض صوفیاء کے فارسی ملفوظات میں ان کی زبان سے نکلے ہوئے ہندی کے۔۔۔۔ الفاظ ااور فقرے مل جاتے ہیں۔۔ اس لسانی مواد پر کلّیے قائم کرنے سے قبل اس بات کی وضاحت کردینا ضروری ہے ، جیسا کہ عبدالحق نے بھی اشارہ کیا ہے ، کہ ہمارے صوفیوں کا تعلق ملک کے مختلف علاقوں سے رہا ہے اور وہ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے تھے۔ اس لیے ہر صوفی کا قول اردو زبان کے تجزیے کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ مثلاً بابا فرید شکر گنج (۱۲٦۷ ۔ ۱۱۷۳ء) کا تعلق پنجابی کے علاقے سے تھا لیکن ان کے بعض فقروں میں پنجابی کے ، دا، کے بجائے اردو ،کا ، ملتا ہے۔ یہی صورت شیخ حمیدالدین ناگوری (۱۲۷۴ ۔ ۱۱۹۳ء) کے ملفوظات کی ہے۔

" فرمودہ است کہ ، عزیز بھلو ہوئیں برو مت ہوئیں ، سب کو پیارو ہوئیں۔

یہ جملہ (او) بنیاد کی راجستھانی کی چھاپ لیے ہوئے ہے اس لیے کہ ناگور کا تعلق اجمیر کے علاقے سے ہے اُردو نے اپنے ارتقا میں (او) بنیاد کے اسماء صفات یا افعال کو کبھی نہیں اپنایا اس لیے ا سے ہم اردو کا فقرہ نہیں کہہ سکتے۔ خیر المجالس میں شامل اُردو نما فقروں کے بولنے والے صوفیہ کی جائے پیدائش اور رہائش کا تعین کیے بغیر ان سے سے بھی لسانی استخراج غیر علمی ہوگا۔ مثلاً ص ۲۱٦ پر علی مولا بدایونی حضرت نظام الدین اولیاء کے بارے میں ، جو سنِ بلوغ میں قدم رکھ چکے ہیں ، یہ پیشن گوئی فرماتے ہیں :

" علی مولانا چوں دید آغاز کرد بہ زبانِ ہندوی ، ارے مولانا یہ

"بڈا ہوسی " یعنی مردِ بزرگ خواہد شد۔ مولانا علاء الدین گفت ،

علی ازکجامی گوئی۔ گفت درد دو چیز ے می بینم، یک آنست کہ
بزبانِ ہندوی گفتند " جو منڈا سا بندی سو پائیں پسری " یعنی آنکہ
دستار برسربند داد درپائے کسے اُفتد ۔"

پہلے فقرے میں " بڑا " کھڑی بولی کے تلفظ کے مطابق ہے لیکن " سی " کا صیغۂ مستقبل ہر چند دکنی اردو میں مسلسل پایا جاتا ہے، اور گجراتی، ماڑواڑی جے پوری اور میواتی تک میں رائج ہے مگر دہلی کی بولیوں سے غائب ہے۔

خیرالمجالس کے ایک اور اُردو فقرے
" تو میرا گسائیں، تو میرا کرتار، مجھ اس تاپ سے چھُڈا "

کھڑی بولی کی قواعد کے مطابق ہے۔، چھُڈا بجائے، چھُڑا، اور، مجھ، بجائے، مجھے، قدیم اردو کے عین مطابق ہے

" زبانِ دہلی " کھڑی کی شکل میں نہ صرف مسلمان لشکریوں اور صوفیوں کے ذریعے چارکھونٹ ہندوستان میں پھیل رہی تھی بلکہ چودھویں صدی عیسوی تک نرگن بھکتوں کے ذریعے رابطے کی زبان حیثیت سے دکن تا پورب اس کی تگ وتاز میں آچکے تھے ۔ مہاراشٹر کے دور دراز گو شے میں بیٹھ کرمراٹھی کے بھکت شاعر نامدیو نے (۱۴۰۸ ۔ ۱۳۱۸ء) اس سے کام لیا ہے۔ وہ اپنے پیغام کو عمومیت دینے کے لئے مراٹھی کو ترک کرکے کبھی کبھی ا سے بھی اپنے لئے ذریعہ ابلا غ بنا تے ہیں :

مائی نہ ہوتی ، باپ نہ ہوتے، کرم نہ ہوتا کا یا
ہم نہیں ہوتے، تم نہیں ہوتے، کون کہا ں تے آیا
چندّیہ نہ ہو تا ، سُو ر نہ ہوتا ، پا نی پون ملا یا
شاستر نہ ہوتا، وید نہ ہو تا ، کرم کہاں تے آیا

کس قدر صاف کھڑی بولی ہے۔

پورب میں یہی زمانہ کبیر داس کا ۱۵۱۵ ۔ ۱۴۴۰ء) ہے۔ ہر چند کبیر نے کہا ہے

میری بولی پوربی تاہے نہ چنئے کوے
میری بولی سومکھے جو پورب کا ہوئے

لیکن کبیر کے کلام، بالخصوص ساکھی کے دوہوں میں ایک ملی جلی زبان ملتی ہے جس میں کھڑی بولی کے روپ بھی جھلکتے ہیں مثلاً افعال کی شکلیں : جانیا، مانیا، پائیا، بجھائیا، جو دکنی اردو سے بھی مخصوص ہیں او ر ہریانوی اور کھڑی بولی کے بعض اضلا ع میں آ ج تک را ئج ہیں۔ البتہ زبان دہلی کے اٹھارویں صدی کے نمونوں میں نہیں ملتیں۔

(۱) کبیر کہتا جات ہوں، سنتا ہے سب کوئے
رام کہہ بھلا ہوئے گا، نہیں تو بھلا نہ ہوئے

(۲) آؤں گا، نہ جاؤں گا، مروں گا، نہ جیوُں گا
گر و کے سبد رَم رَم رہوں گا

(۳) کبیؔر من نِرمَل بھیا جیسا گنگا نیر

(۴) کبیؔر لُوٹنا ہے تو لوٗٹ لے، رام نام ہے لوٹ
پھر پاچھے پچھتا ہوگے، پران جائیں گے چھوٹ

(۵) کبیؔر میرا مجھ مینہ کچھ نہیں جو کچھ ہے سو تیرا
تیرا تجھ کو سو نپے کیا لاگے میرا

(۶) کبیؔر کورری کورَی جور کےجورے لاکھ کرور

(۷) کبیؔر ہر کا سُمرن چھاڈ کے پالیوٗ بہت کٹنب

ان اشعارمیں کھڑی کے کئی روپ ملتے ہیں جو پندرھویں صدی عیسوی میں شمال تادکن عام ہوچکے تھے۔ /گ/ سے مرکب صیغۂ مستقبل (مروں گا، جاہیں گے، ہوہے گا وغیرہ)۔ ہائے زائدہ کے ساتھ افعال (پچھتا ہوگئے، جاہیں گے، ہوے گا وغیرہ)۔ ہائے زائدہ کے ساتھ افعال (پچھتاہوگئے جاہیں گے جو دکن اردو سے لے کر اٹھارویں صدی تک کی زبانِدہلی میں پائے جاتے ہیں) 'ہوا' کے 'بھیا' کا ماضی (جو قدیم اردو میں جابجا ملتا ہے)۔ 'چھوڑ' کے بجائے چھاڈ('ڑ' پر' ڈ' کو ترجیح جو قدیم اردو کی عام خصوصیت ہے حالاں کہ 'پوربی بولی' سے یہ بعید ہے)

اُردو زبان کی تشکیل کا دوسرا پہلو یعنی عربی فارسی الفاظ کی آمیزش کا رجحان بھی کبیؔر کے یہاں موجود ہے۔ محمود شیرانی کے بقول کبیر کے کلام کے دس فی صد الفاظ اس نوعیت کے ہیں:

انداجا (اندازہ)، آجائیں (عذاب)، اِکھلاس (اخلاص)، اِپھترا (اِفترا)، اِکتیار (اختیار)، اُجو (وضو) کتیب (کتاب = قرآن)، کرم، کریم، کاجی (قاضی)، کلف (قفل)، کھلک (خلیق)، کھسم (خصم)، تریکت (طریقت) دگائی (دغائی =داغنے سے)، دَپھتر (دفتر)، دمامہ، درگاہ، درحال، دروگ (دروغ)، جَردرو (زرد رو)، دستگیری، دُنی (دنیا)، دوجک (دوزخ)، نوبت، نار، نی بگ (کم بخت)، نسانہ (نشان)، پروردگار، پریسانی (پریشانی)، پلیت (پلید)، پلیتا (فلیتا)، پاکم پاک، پاساری (پاسداری)، پُرجا پُرجا (پرزہ پزرہ)، بیگامبر (پیغامبر)، پھرمان (فرمان)، پھکر (فکر)، پھرمائی (فرمائی) بندگی، بندہ، بکھسی (بخشش)، برکس (برکت)، بیدار، بھستی (بہشت)، مجلس، مَردَن (جمع مَردَ)، مسکین، مسیت (مسجد)، میانے (میان، درمیان)، میرحمت (مرحمت)، مُلاّں (مُلاّ)، رباب، رحمانا (رحمٰن، رجم (رجعت)، روجا (روضہ)، صد، صبوری، سلار (سالار)، سہوٗ (سہو)، ثابت، ستاب (شتاب)،

سہر (شہر)، سُنّت، سیکھ (شیخ)، حک(حق)، حجری (حضوری)، ملال، ہوائی،حال،گور۔

اسی طرح فارسی کے اکثر محاورے جو اردو کے ذریعے رائج ہوگئے تھے، ان کے کلام میں موجود ہیں، مثلاً نوبت زدن کبیر نوبت آپنی دس دن لیہو بجائے

تیشہ برپازدن پانوْکلہاڑی ماریا مورکھا اپنے ہاتھ

ہندی شعرا میں پندرہویں صدی کی 'ہندوستانی' کی سب سے مستند شکل ہمیں کبیّر ہی کے کلام میں ملتی ہے۔ اس وقت تک کھڑی بولی رابطے کی زبان کے طور پر ایک کل ہندحیثیت اختیار کرچکی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کبیّر کے دوہے پورب سے لے کر پنجاب تک عام مقبول تھے جس کا ثبوت گروگرنڈ صاحب، سکھّوں کی مقدّس کتاب ہے، جس میں کبیر کے کلام کو بڑی صحت کے ساتھ محفوظ کردیا گیا ہے۔

"زبانِ دہلی" پورب اور دکن کے علاوہ پنجاب میں بھی اپنا گھر کررہی تھی، اس کا بین ثبوت گرو گرنڈ صاحب میں شامل، گرونانک (۱۵۲۹۔ ۱۴۶۹ء) کا کلام ہے جو "جپ جی" کے نام سے موسوم ہے۔ لِسانی نقطۂ نظر سے ان کا یہ کلام اسی سلسلے کی کڑی ہے جو نامدیواور کبیّر جیسے سنتوں سے شروع ہوتا ہے، یعنی ایک طرف فارسی عربی کے عام مروجہ الفاظ کی آمیزش اور دوسری جانب ان لسانی اثرات کو قبول کرنا جو دہلی کے سر چشمے سے پھوٹ کر ہندوستان میں چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ گرونانک کا بیشتر کلام ان کی مادری زبان پنجابی میں ہے۔ کچھ اشعار شعر کی روایتی زبان برج میں بھی مل جاتے ہیں۔ لیکن وہ بھی کھڑی بولی کی ہمہ گیریت سے نہ بچ سکے۔ بعض لسانی خصوصیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

(۱) ان کے کلام میں پنجابی کے حروفِ اضافت (دا۔ دی ۔ دے) کے ساتھ کھڑی کے (کا۔ کی ۔ کے) استعمال کیے گئے ہیں (ص ۳۰)

(۲) تطویلِ مصّوتہ کی بھی مثالیں موجود ہیں: 'لک، کے ساتھ، لاکھ، (ص ۳۹۶)،پچھے، کے ساتھ، پاچھے، (ص ۱۴)۔ اُپر، کیساتھ، اُوپر، (ص ۳۶۵)

(۳) (ڈ) کے ساتھ ساتھ (ڑ) کا استعمال (ص ۳۹)

(۴) افعال میں کھڑی اور دکنی اردو کی طرح وچارنا (ص ۱۵)، نکسنا (نکلتا) ص ۲۵)، بوجھنا (ص ۲۶۔ قدیم اردومیں، سمجھنا، کے لئے 'بوجھنا' کا فعل رائج رہا ہے)، بھاؤنا، سماؤنا (ص ۲۹)، پتیانا (ص ۳۰)

(۵) 'والا' کا لاحقہ مابعد کا ارتقا ہے، دکنی اردو کھڑی، ہریانی اور برج میں ہمیشہ "ہارا" آیا ہے جیسے، جانہارا، پنہارا (ص ۴۲)

(۶) کچھ ضمائر بھی مشترک ہیں مثلاً؛ دِن (=اُن ص ۲۔ دہلی اور اس کے نواح میں اب تک رائج ہے)۔ تیرے (ص ۱۰) میرے (ص ۱۲)، تیری (ص ۱۳) ہمری (=ہماری، ص ۱۴)، تمہارے (ص ۱۴)، ہمارا (ص ۲۰)

عربی فارسی کے لفظ بھی، تلفظ کے ہیر پھیر کے ساتھ بہ کثرت ملتے ہیں، نمونہ کلام:

آوت کو جاتا کہیں، جاتے کو آیا
پَرکی کرا پنی کہیں، ا پنو نہیں بھایا
میٹھے کو کڑوا کہیں، کڑوے کو میٹھا
دا نے کو نِندا کرہیں، ایسا کل ماہی دیٹھا

مذکورہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ بابرؔ کی فتح دہلی (۱۵۲۶ء) سے قبل ہی شمالی ہند میں ایک رابطے کی زبان کا ہیولیٰ تیار ہوچکا تھا، یہ زبان اس علاقے کی دوسری بولیوں کو متاثر کررہی تھی۔ تغلقوں کے عہد میں دہلی کے بازاروں میں ہریانہ کی آبادی کا جمگھٹ تھا۔ لودھی درالسلطنت کو دہلی سے اٹھا کر برج بھاشا کے علاقے میں آگرہ لے گئے۔ بابر کا دربار لگا ہوا ہے، ایسے میں ابراہیم لودھی کا سرکاٹ کر سامنے لایا جاتا ہے۔ اس وقت کوئی ہندی شاعر کہہ اٹھتا ہے:

نو سَے او پر تھا بتیسا پانی پت میں، بھارت دیسا
اٹھیئس رجّب سُکّربارا با بر جیتا، براہیم ہارا

(یعنی ۹۳۲ھ تھی، اٹھویں رجب، جمعہ کا دن تھا جب پانی پت، بھارت دیس میں بابر جیتا اور ابراہیم ہارا)

ان اشعار کی زبان کا تجزیہ کیجئے تو اس کی قدامت پر صاد کرنا پڑتا ہے۔ بتیسا (بتیس ۳۲)، دیسا (دیس)، اٹّھئس (آٹھویں) رجّب (رجب)، سکّربارا (شکروار=جمعہ)، ہریانوی کی صوتیات سے مطابقت رکھتے ہیں۔

لسانی نقطۂ نظر سے سترھویں صدی کے اواخر کی سب سے اہم تصنیف محمد افضل، افضل کی بکٹ کہانی (بارہ ماسہ) ہے افضل کے سنہ پیدائش کا علم نہیں لیکن ان کے انتقال کی تاریخ علی قلی خاں والہ داغستانی کے ذکر بحیثیت فارسی شاعر کے کیا گیا ہے) ۱۰۳۵ھ مطابق ۲۶/ ۱۶۲۵ء درج ہے۔ افضل کی بکٹ کہانی کے سلسلے میں پہلا مستند اشارہ اکرم رہتکی المتخلص بہ قطبیؔ کے "تیرہ ماسہ" میں ملتا ہے جو ۱۱۴۳ھ مطابق ۳۱ / ۱۷۳۰ء بھی افضل کے تقریباً ۱۰۵ برس بعد لکھا گیا ہے، جس میں افضل کے "بکٹ افسانہ" اور اس کے وطن نارنول (ہریانہ) کا ذکر ہے؛

پریم قصہ ہوا ہے آ خر یا رو تیرہ ماسہ بھی اس کے تاں بچارو
بارہ ماسا ہوئے تھا اور سب کے تیرہ ماسہ ہوا جاکر قطبؔ کے
بکٹ افسانہ کا ہے یہ تو بھیّا دونوں کے تاں جنا ہے دوئ میاّ
اولیں افضل کہ جس کانا نوؔ گوپال کیا ہے، نار نولی صاحب جمال

افضل کے وطن بارے میں مختلف تذکرہ نگاروں نے پانی پت (والہ داغستانی) تھانسیر (تذکرہ آفتاب عالم

تااب ،قبل ۱۸۷۸ء) جھنجھانہ (قائم) اور نارنول (ہریانہ) بتایا ہے ۔ اس میں سب سے قدیم شہادت کی رو سے نارنول ہی اس کا وطن قرار پاتا ہے، اس لیے ہریانوی کے علاقے کا باشندہ تسلیم کیا جانا چاہئے۔

۳۲۵ ا شعار پر مشتمل یہ بارہ ماسہ شمالی ہند کی اردو کا پہلا مربوط اور مسلسل کارنامہ ہے جس میں بارہ ماسے کی ہندوستانی روایت اور خسرو کی ریختہ گوئی کے تجربے دونوں کی آمیزش ملتی ہے ۔ اس کی زبان ایک طرف برج بھاشا کے گیتوں کی زبان کی سرحدیں چھولیتی ہے تو دوسری طرف بعض اشعار اور مصرعے خالص فارسی میں لکھے گئے ہیں ۔ افضلؔ کے سامنے شمالی ہند میں اردوشاعری کی کوئی روایت یا نمونے نہیں تھے ، بجزاس کے کہ وہ ریختہ گوئی کے اسلوب سے واقفیت رکھتا تھا ۔ ۱۶۰۰ء تک دکن میں اردو شاعری کا جو سرمایہ جمع ہوچکا تھا اسکا بھی ا سے کوئی علم نہیں تھا اور ہوتا بھی کیوں کر اس لیے کہ اکبر اور جہاں گیر، جن کا زمانہ اس نے دیکھا ، اس وقت فتوحات دکن میں مصروف تھے اس لیے لشکریوں کی آمدورفت کے علاوہ ہر قسم کے تہذیبی لین دین کے دروازے مسدود تھے ۔

بکٹ کہانی کی زبان مجموعی طور پر ایک سّیال لسانی کیفیت کی غماز ہے ۔ اس کی بنیادی بولی توکھڑی ہے لیکن برج بھاشا اور فارسی نے ا سے بری طرح جکڑرکھا ہے ۔ اس کا لسانی تجزیہ کئی وجوہ سے ضروری ہے ۔

"بکٹ کہانی" کی زبان عہد اکبری کی کھڑی بولی کا وہ روپ ہے جو دہلی اور اس کے نواح سے نکل کر برج ، اودھی اور ہریانوی کے علاقوں میں پھیل چکا تھا ۔ مولف ، پنجاب میں اردو ، نے لکھا ہے " اس کی زبان دکنی سے مختلف اور صاف ہے " لسانی اعتبار سے افضل کی زبان کو جدید اردو سے قریب تر ہونا بھی چاہیئے ۔ دکنی اُردو تیرھویں اور چودھویں صدی کی " زبانِ دہلوی " ہے جس کی اساس کھڑی بولی کے مقابلے میں جمنا پار کی ہریانوی اور میواتی (راجستھانی بولی) بولیوں پر قائم ہے ۔ دہلی اور اس کے نواح میں زبان کا یہ کینڈا پندرھویں صدی کے وسط تک رہا ۔ سنہ ۱۵۰۴ کے قریب جب سکندر لودھی نے راج دھانی کو دہلی سے آگرہ منتقل کیا تو لسانی مرکزِ ثقل ہریانوی اور کھڑی کے علاقے سے برج بھاشا کے علاقے میں منتقل ہوجاتا ہے ۔ افضل کا تعلق اکرمؔ رہتکی کی قدیم ترین شہادت کے مطابق قصبہ نارنول (ہریانہ) سے تھا ، لیکن افضل کی زبان ہریانوی کے اس قدر بھی اثرات نہیں رکھتی جس قدر کہ اس عہد کے دکنی مصنفین (محمد قلی قطب شاہ، وجہی ، غواّصی ، عبدل) کی زبان میں پائے جاتے ہیں ۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ کھڑی بولی عہد اکبری میں برج بھاشا کے زیر اثر ایک ایسی لسانی کروٹ لے چکی تھی جس نے ا سے جدید بنادیا تھا ۔ افضل کی بکٹ کہانی اس جدید اردو کا پہلا ادبی و لسانی نقش ہے ۔ مجموعی طور پر افضل کی زبان سورداس کی برج اور کبیر داس کی ، سدھکڑّی ، زبان کے برعکس کھڑی بولی کی وہ ترقی یافتہ شکل ہے جس کی تربیت آگرہ کے بازاروں میں ہوچکی تھی بکٹ کہانی کی زبان پر فارسی کے علاوہ برج بھاشا کے بھی اثرات واضح ہیں ، برج پندرھویں اور سولھویں صدی میں ادبی زبان کی حیثیت سے نمایاں مقام

حاصل کرچکی تھی بلکہ کرشن بھکتی کی تحریک کے ذریعے شمالی ہند کے بڑے حصّے میں مسلّمہ ادبی زبان کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ مزید کہ افضل کو اپنے قیامِ متھرا کے دوران کرشن بھکتی کی زبان کا بھرپور تجربہ حاصل ہوچکا تھا شاید یہی وجہ ہے کہ افضلؔ نے اپنے بارہ ما سے کے لیے ہریانوی کا انتخاب نہیں کیا۔ اس کے یہاں ہریانوی کی پٹ اس قدر بھی نہیں ملتی، جیسا کہ بعد کے ہریانوی ادیب اکرمؔ رہتکی کے " تیرہ ماسہ " میں ملتی ہے۔ جو بکٹ کہانی کے تقریباً سو برس بعد کی تصنیف ہے، ہریانے کے دوسرے مصنف اور لغت نگار عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات ہندی بھی اٹھارویں صدی کے چوتھے دہے کی تصنیف ہے، اسکی زبان (جس کی تصحیح خانِ آرزو نے ۱۷۵۱ء میں نوادر الالفاظ میں کی ہے) اور افضل کی زبان میں خاصا فرق ہے۔ غرائب اللغات کی 'کوزیت'، 'ہائیت اور غیرہائیت'، اور 'انفیت'، بکٹ کہانی میں نہیں پائی جاتیں:

(الف) صوتی خصوصیات

(۱) تطویلِ مصوتہ ہانسی (ہنسی)، پاتی(پتر، خط)

(۲) /ل/پر / ر/ کوبرج کے زیر اثر ترجیح: گر(گل،اگلا)،کاری(کالی)سانورا(سانولا)، جرنا (جلنا)، ڈارنا (ڈالنا)

(۳) عربی فارسی اصوات کا ہندی تلفظ: لرجا (لرزا)، داگ (داغ)

(ب)صرفی خصوصیات

(۱)اسمائے ضمیر: تَیں (تو)، تمری (تمہاری)، تمن (تم)، ھَوں (=میں ۔محمد قلی قطب شاہ کی ریختیوں میں ملتا ہے اور خالص برج ہے)، ھھمن (ھم)، کنِھیں (کسی)

(۲) "اں "کی جمع کی بعض مثالیں: دھوپاں (دھوپ کی جمع)، سیراں (سیر کی جمع) بکٹ کہانی میں عام طور پر جمع " وں" سے بنائی گئی ہے۔ " ن "کی جمع، جو برج بھاشا میں رائج ہے صرف کہیں کہیں ملتی ہے مثلاً پگن (پگ (پاؤں) کی جمع)

(۳) افعال کی صرف بعض شکلوں میں برج کے اثرات نمایاں ہیں بھئی (ہوئی)، رَدوَت، سُلگت، بَھرت، مَرت، دیکھن، ہنسن، کھیلن

(۴) کیتا (کیا)، کینا (کیا)، دینا (دیا) کی شکلیں بھی مل جاتی ہیں۔

کیتا، دکنی اردو میں عام رائج رہی ہے۔

(۵) افعال کے مصادر، جدید اردو کے برعکس، (و) کے اضافے سے بنائے گئے ہیں۔ آونا، بھاونا، شرماؤنا، یہ ان سے ماخوذافعال کی دیگر شکلوں میں بھی ملتا ہے۔ ایسے افعال اٹھارویں صدی کے وسط بلکہ اس کے بعد تک رائج رہے ہیں۔

(٦) حروف کی بعض قدیم شکلیں ملتی ہیں جن میں سے بیشتر برج بھاشا کی ہیں : سُوں ، سِیں ، سیتی ، کوں، اجھوں، کِت (کہاں)، موں (مِیں) کہا (کیا) ، کوُلو(کب تک) ،کاں لگ (کہاں تک)، کہوں (کہیں)

(۷) پنجابی کا صرف ایک حرف دوبار استعمال ہوا ہے نال (=ساتھ)

ع پیا کے نال بیٹھیں ساریاں سب

ع بجاویں دف پیا کے نال ساری

(ج) نحوی خصوصیت

(۱) ایک آدھ مثال ایسی بھی ملتی ہے کہ اگر اسم مونث جمع ہے تو صفت بھی جمع لائی گئی ہے۔

ع پیا کے نال بیٹھیں ساریاں سب

ع بہ عالم پھولیاں پھلواریاں سب

اس خصوصیت کا سلسلہ اٹھارویں صدی کے وسط تک چلتا رہا۔

اسی زمانے کی تصنیف " خالق باری " ہے جو امیر خسرو سے منسوب ہوتی آئی ہے لیکن جس کا اصل مصنف محمود شیرانی کے خیال میں ایک گمنام ملائے مکتب ضیاء الدین خسرو ؔ ہے جس نے 'حفظ اللسان ' کے نام سے نصاب الصبیان کے طور پرا سے عہد جہاں گیری میں ۱۰۳۱ ھ مطابق ۱۶۲۱/۲۲ سنہ عیسوی میں " چند کلماتِ عربی وفارسی رابزبانِ ہندی گوالیاری کہ درباب روز مرّہ رانا گزیر است" ترتیب دیا تھا۔ خالق باری کی زبان افضل کے بارہ ماسے کی زبان سے خاصی مختلف ہے ، ضمائر اور افعال کی بھی بعض ایسی شکلیں ملتی ہیں جو دکنی اردو میں تو ملتی ہیں لیکن شمال میں انھیں متروک ہوئے عرصہ ہوگیا تھا

صَوتی خصوصیات :

(۱) تطویلِ مصّوتہ کی مثالیں ملتی ہیں : پاٹی (پٹّی)پاگ (پگ) چاکھنا (چکھنا) کیلی (کِلّی)، بیلی (بلّی) بیچھو (بچھّو) پاتھر (پتّھر) موکی (مکّی) کوتا (کتّا) ، چالنی (چھلنی) ماٹی (مٹّی) ، کال (کل)

(۲) مصوتوں کو انفیانے کا رجحان کثرت سے ملتا ہے۔

چمکناں ، ہنسناں ، چاندنیں ، کہنیں (کہنی) ، تاناں باناں (تانا، بانا) توں ، کوں ، پانیں ، رونکھ (روکھ) ،

(۳) ہائے مخلوط (نفَسی آوازوں) کا استعمال قلّت سے ہوا ہے۔

بھوک ، مورک (مورکھ) ، پڑناں (پڑھنا) ، تیڑی(تیڑھی) چولا (چولھا)

(۴) غیر ضروری ہکاریت (نفسیت) کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ پالکھی (پالکی)

نحوی خصوصیات:

ضمائر کی حسبِ ذیل شکلیں قابل توجہ ہیں :

(۱) واحد متکلم کے لیے برج (گوالیاری) کے 'ہوں' کا استعمال

خواہم گفت کہوں گا ہوں	خواہی گفت کہے گا توں
خواہم رفت جاؤں گا ہوں	خواہی رفت جاوے گا توں
خواہم نشت بیٹھوں گا ہوں	خواہی نشت بیٹھے گا توں
خواہم زد، ہُوں ماروں گا	خواہی زد توں مارے گا
خواہم دوید، دوڑوں گا ہوں	خواہی دوید، دوڑے گا توں

یہ طویل اقتباس دینے کی ضرورت اس وجہ سے پڑی کہ ایک تو 'ہوں' کے تلفظ کا برونِ 'توں' یقین ہوجائے، مزید یہ کہ انفی 'توں' کی ضمیر واضح ہوجائے۔ ضمناً (و) سے مرکب افعال کے شکلیں نمایاں ہوجائیں :

جاوے گا، دھووے گا، دیوے گا، وغیرہ

ضمائر کی دیگر شکلیں جو خالق باری میں ملتی ہیں یہ ہیں :

آپس (آپ ۹۱)، توں (تو)،

(۲) افعال میں امدادی فعل کے طور پر 'آہے' (=ہے) بکثرت استعمال ہوا ہے : آہے :

ع مغز آہے گود گلیم است کاملی (۱۰۰)

ع ریدلید گھوڑے کی آہے (۸٦)

(۳) ماضی مطلق کی ترکیب (ا) کے علاوہ (یا) کے ساتھ بھی ملتی ہے

ترابگفتم، میں تجھ کہیا کجا بما ندی، توں کت رہیا

(۴) "جیونا" اور "پیونا" مصادر کے طور پر استعمال ہوئے ہیں (۸۴)

خالق باری کی زبان انفیت، تخفیف مصوتہ اور مشدّد الفاظ کے نقطۂ نظر سے مائل بہ قدامت ہے۔ لیکن یہ فرق اس عہد کے ایک لغت نویس اور شاعر کی زبان کا فرق ہے۔ دراصل کسی زبان کے ارتقا کی داستان کا انحصار اس زبان کے عہد بعہد کے تحریری ادب پر ہوتا ہے جو اس عہد کی بول چال کی زبان سے بہر صورت مختلف ہوتا ہے۔ لیکن تاریخی لسانیات کے ماہر کا یہی کچھ سرمایہ ہوتا ہے جس سے وہ لسانی نتائج کا استنباط کرتا ہے۔

سترھویں صدی ختم ہوتے ہوتے ہمیں اس عہد کی عوامی زبان کی سب سے بڑی دستاویز یعنی روشن علی کے عاشور نامہ سے سابقہ پڑتا ہے جسے اس نے سہارن پور، یعنی ٹھیٹھ کھڑی بولی کے علاقے میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ عاشور نامے کی زبان سترھویں صدی عیسوی کے اواخر کی وہ عوامی زبان ہے جو مغربی اتر پردیش کے

بالائی دو آب میں رائج تھی۔ بالائی دوآب آج چار اضلاع پر مشتمل ہے۔ شمال سے چلئے تو سہارن پور، مظفر نگر، میرٹھ اور نوتراشیدہ ضلع غازی آباد (جو پہلے ضلع میرٹھ میں شامل تھا) ملتے ہیں۔ روشن علی ایک ملاّ ئے مکتب اور کم سواد تک بند ہے جو " فائدہ عام" اور "ذاتی ثواب" کی خاطر واقعہ کربلاکو منظوم کرنے کی کوشش کرتا ہےوہ اپنی زبان کو کہیں بھی 'ریختہ' نہیں لکھتا بلکہ "ہندی" "ہندی زبان" " زبانِ ہندوی " اور زبان ہندوستانی (ع زباں ہندوستانی میں بولا عیاں : شعر ۳۵۱۷) کے نام سے یاد کرتا ہے۔

صَوتی خصوصیات :

(۱) صوتی نقطۂ نظر سے عاشورہ نامے کی سب سے نمایاں خصوصیت روایتی قواعد کی اصطلاح میں حرف کو ساکن سے متحرک بنادینا ہے جسے ، اضافۂ مصوتہ ، کہا جاسکتا ہے :

شَکل ، رَحَم ، نَظَم ، اَصِل(قافیہ دِل) طِفلَ، مِصَر،عَقَل،ذِکَر، شناخَت وغیرہ۔ تخفیف مصوتّہ کی مثالیں بھی ملتی ہیں : تلاب (تالاب) ، جناوار(جانور)

(۲) اس کے بر عکس کبھی کبھی پنجابی لہجہ کے مطابق تخفیف مصوتہ کا رجحان بھی ملتا ہے جسے متحرک کو ساکن کردینا کہتے ہیں :

صِفْت، طَرْف ، عَرْب ، قسْم، ان تلفظات کا التزام ہر جگہ ضروری نہیں۔ دوسری جگہ صِفَت ۱۲ اور مِصرَ بھی ملتے ہیں۔

(۳)ایک اور اہم صوتی خصوصیت مصوتوں کا انفی کردیتا ہے جو قدیم اردو میں عام طور پر پائی جاتی ہے اور جسے اکثر مرتب ، املا ، کی غلطی خیال کرتے ہیں۔ (مراثی ریختہ اور متقدمین شعرائے اردو کے یہاں بھی بکثرت موجود ہے)

فاطماں (قافیہ عیاں) ، سناں (قافیہ بیاں) =سنا ، کہناں (قافیہ پنہاں) =کہنا ، کوچ در کوچ (کوچ در کوچ) ناں (=نا، نہ قافیہ عثماں)، دیاں (دیا)، ناناں (نانا)

(۴) اس کے برعکس انفی مصوتوں کو غیر انفی بتادینے کا رجحان بھی جابجا ملتا ہے ، انفیا نے کی مانند غیرانفی بنانے کا رجحان بھی شورسینی اپ بھرنش کی دین ہے۔

کوا(کنواں) ما(ماں) (دونوں لفظ اسی املا کے ساتھ قصّہ مہر افروز و دلبر میں بھی ملتے ہیں (۱۷۵۴ء) بلکہ " ما"، تو میرامن (۱۸۰۲ء) تک کے یہاں موجود ہے)

(۵)سہارن پور ، مظفر نگر اور میرٹھ مشدّد الفاظ کے کثرت استعمال کی وجہ سے "اضلاع مِشدّدہ "کہے جاتے ہیں :

کُلّ ، ابنِ ،حُرّ، جگّہ (دوسرے مقام پر جاگہ بھی آیا ہے ،) اِتی(اتنی)

(٦)قدیم اردو کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ اس میں درمیانی /ہ/ گرادی جاتی ہے اور نفَسی آوازیں اپنی /ھ/ کھودیتی ہیں۔ عاشورنامہ میں یہ دونوں خصوصیتں بہ کثرت ملتی ہیں :

توئی (توہی)، نیئں (نہیں)، وو (وہ) (قافیہ دو) کاں (کہاں)،

ع کہاں سیتی آئے گا کاں ہویگا۔ سات (ساتھ)، چلنی (چھلنی) اس کے برعکس

ہائے زائدہ کی مثالیں بھی ملتی ہیں : تڑپھنا (تڑپنا)، دوکھا (دھوکا) مھوں (منہ)،

موہری (موری)

صرفی خصوصیات :

(١) اسماء کے سلسلے میں سب سے قابل ذکر بات صیغۂ جمع سے تعلق رکھتی ہے۔ عاشورہ نامہ میں (اں) سے مرکب صیغے دکنی اردو کے برعکس صرف عربی فارسی الفاظ کے ملتے ہیں مثلاً

مرسلاں، شہیداں، مرداں، سواراں، دینداراں، ظالماں، کافراں، کوفیاں، مومناں،

قدرتاں، موذیاں، ملکاں (ملائک)

یہ سب لفظ مفرد آئے ہیں۔ صرف ایک ہندی لفظ ہے جس کی جمع (اں) سے بنائی گئی ہے :

پکھالاں (شعر٣١)۔ باقی ہر جگہ ہندی الفاظ کی جمع (ـوں) کے اضافے سے بنائی گئی ہے۔ ان کے علاوہ فارسی الفاظ کی جمع بھی اکثر (وں) سے ملتی ہے مثلاً شہیدوں، گناہوں، کوفیوں۔(اں) کی جمع جو دکنی اردو کی عام خصوصیت ہے، سترھویں صدی کےاختتام تک (وں) کی جمع کے لیے جگہ خالی کردیتی ہے۔

(٢) تذکیر و تانیث کے سلسلے میں عاشورنامہ کی زبان جدید اردو سے اکثر مقامات پر مختلف ہے۔ مثلاً عربی کے تائے تانیث پر ختم ہونے والے ذیل کے الفاظ روشن علی نے مذکر باندھے ہیں :

خلافت، مصلحت، سکونت، شہادت، زیارت، قیامت، بشارت، رفعت ان کے علاوہ ذیل کے الفاظ بھی مذکر استعمال ہوئے ہیں :

خَلْق، تصدیق، خبر، فکر، فجر،،ندا، جفا، جزا،

(٣) عاشورنامے کے بیشتر اسمائے ضمیر موجودہ اردو کے مطابق ہیں۔ البتہ چند ایسے ہیں جو قدیم اُردو کی باقیات کے طور پر نہ صرف اس عہد میں بلکہ اٹھارویں صدی عیسوی کے مصنفین تک کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

ہمنا (ہمارے)، ہمن (ہم)، تمہن (تم) تمری (تمہاری)، تیں (تو)، تمن (تم)، ہم (ہمارے مثلاًہم پاس) وو (دو کے ساتھ قافیہ)، دے (جمع وہ)، انھوں کو (ان کو)، اونے (اُن نے)، اپس

(اپنے)، کو (کوں)، تمَ (تُم) (قافیہ ہم اور ضَم۔ ہریانوی اور کھڑی کا عام تلفظ)، دِن (اُن)، یے (یہ جمع)

(۴) عاشور نامے کے افعال کی شکلیں کم و بیش وہی ہیں جو اٹھارویں صدی کے نصف اول تک رائج رہیں اور آج بھی عوامی زبان میں سنی جاسکتی ہیں۔ ہر چند فصیح تسلیم نہیں کی جاتیں:

لیوے، ہووے، سووے، دیوؤ، لیؤ، ہیگا، کروں ہوں، رو دیں، آوتا

فعل کی ایک قدیم شکل جو اٹھارویں صدی میں متردک ہوگئی تھی، اتھا (تھا) اور اتھی (تھی) ہے۔ یہ عاشورنامہ میں شاذ مل جاتی ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے مطابق یہ اس عہد کے مراثی ریختہ میں بالکل نہیں ملتی۔

بعض اوقات روشن بولیوں کے افعال کا بھی استعمال کرتا ہے، مثلاً حضرت محمدؐ جبرئیل سے پوچھتے ہیں: ابابکر اور عمر عثماں ہوئیں

فرشتے نے بولا کوئی ناں ہوئیں

ہوئیں = برج بھاشا ہوئیں (=ہونگے)

حروف اور متعلق فعل:

(۱) ان کی خاص شکلیں حسبِ ذیل ہیں:

آگا (آگے)، بِھتّر (قافیہ سخت تر)، کدہی (کبھی)، لک (تک)، تائیں اِتا (اتنا)، کیتے (کتنے)، مَنے (مِیں)، سوں (سے)، موں (میں) نے (سے)، سیتی (سے)، ستی (سے)، اِنّی (اتنی) کوں (کو) اِتے (اتنے)، بھوت (بہت)،

(۲) اضافت اور واؤ عطف ہندی اور فارسی الفاظ کے درمیان لائے گئے ہیں لیکن بہت کم

فرہنگ

فرہنگ کے لحاظ سے عاشور نامے کی زبان خاصی جدید ہے۔ متروک ہندی الفاظ کی جو کثرت دکنی اردو کے ادیبوں کے یہاں ملتی ہے اس کا یہاں فقدان ہے۔ بکٹ کہانی کی طرح فارسی کے الفاظ کی آمیزش سے بھی عاری ہے۔ یہ ایک عوامی بولی کا روپ ہے جس کا مالوہ کی مالوی بولی سے دور کا بھی واسط نہیں۔ موجودہ اُردو کے نقطۂ نظر سے حسبِ ذیل متروک الفاظ قابلِ توجہ ہیں: گُپت، پرگھٹ، اَدھِک، سرساں (پریشان)، جیو، اچرج، نرنکار، ٹھور، بچن، کھیت (میدانِ جنگ)، بھو (عورت)، اگن، نار (عورت) مَنس (منیشہ)، مِرگ (ہرن)، ایکلا (اکیلا)، نیر (پانی)، مَرمَ (بھید)،

جنا وار (جانور)، قبیلہ (گھروالی)، خلافات (خلافت)، بیان وار (تفصیل واریہ لفظ باربار آیا ہے)، عجوب (عجب)، بگال (بغل)، تگا (تاگا)، چلاکی (چالاکی)، رَگت (خون)، روپنا (سامنے کرنا)، زہیر (لاغر، دکھی۔ یہ لفظ باربار آیا ہے)، شورشار (ہنگامہ)، صفا (صاف)، غفلت (غفلت)

نحوی خصوصیات :

نحوی اعتبار سے عاشورنامہ کی زبان پر فارسی اس قدر اثرانداز نہیں جس قدر کربل کتھایا " مراثی ریختہ" کی زبان میں ملتی ہے۔

(۱) نے، فاعلی کا استعمال بے ترتیب طور پر ملتا ہے، کبھی محذوف ہے

ع میں محنت سے پالا تھا دل خواہ کو

کبھی موجود ہے : ع بہت سے دلا سا خلیفہ نے کی

(۲) علامت مفعولی، کو، کو بھی حذف کردیا جاتا ہے مثلاً مجھ = مجھ کو

روشن علی ہی کے معاصر اسمٰعیل امروہوی ہیں جن کا سالِ وفات ۱۲ / ۱۷۱۱ء متعین کیا گیا ہے جن سے دو مثنویاں یادگار ہیں :۔ " وفات نامہ بی بی فاطمہ " اور معجزہ أنار" جن کا سنہ تصنیف علی الترتیب ۱۶۹۲ء اور ۱۷۰۸ء ہے اسمٰعیل امروہہ کے رہنے والے تھے لیکن بہ سلسلہ ملازمت ان کا دکن (اورنگ آباد) میں قیام ۲۰، ۲۵ سال تک رہا تھا۔ ہر چند مثنوی کے مرتب، نائب حسین نقوی نے انھیں " دلّی کی دو قدیم ترین مثنویاں "کہا ہے (انھیں اس وقت تک روشن علی کے عاشورہ نامہ کا علم نہیں تھا) تاہم لسانی اعتبار سے ان کا سلسلہ اورنگ آبادی اردو سے ملتا ہے نہ کہ شمالی ہند کی ٹھیٹھ اردو سے۔ اس لیے لسانی استنباط کے لیے اس کی زبان کو مستند نہیں مانا جاسکتا۔ مثلاً اسمٰعیل امروہہ کا باشندہ ہوکر " چ" تخصیصی کا استعمال کرتا ہے مثلاً اسیکا چ (اس کا ہی)۔ کہیں /چ/ کے بجائے / ج/ کا بھی استعمال ہے جو اسی کی گجراتی شکل برائے تاکید ہے۔ روشن علی کی طرح اس کے یہاں (-وں) کی جمع بھی متعین نہیں ہوئی ہے اس لیے (اں) کی جمع کا خاصا استعمال ہے۔ ماضی کی قدیم شکلیں لائیا، ڈھونڈھیا، پائیا، جائیا، آئیا، کھائیا، توڑیا وغیرہ ملتی ہیں جن سے اس عہد کی " زبانِ دہلی" عاری ہوچکی تھی۔ یہی صورت اسمائے ضمائر اور اکثر حروف کی ہے۔ اسی لیے ہم نے اسمٰعیل کی زبان کا اپنے تجزیے کے لیے وسیع پیانے پر استعمال غیر ضروری سمجھا۔ اسمٰعیل کی ان مثنویوں کی موجودگی سے بہرحال ایک امر مسلم ہوجاتا ہے کہ عہد عالمگیر کے اورنگ آباد اور شاہجہاں آباد (دہلی) کی زبان میں بہت زیادہ فرق نہیں تھا۔ اسی لئے ایک شاعر جس کی جوانی کی ساری عمر عالمگیر کے لشکری کی حیثیت سے نواح اورنگ آباد میں گذری ہو جب اپنے وطن امروہہ میں بیٹھ کر (جو خالص کھڑی اور معیاری اردو کے ضلع مرادآباد کا ایک مردم خیز قصبہ ہے) مثنویاں لکھتا ہے تو اسے یہ اعتماد ہے کہ اپنی شاعری کے لیے جو زبان وہ استعمال کررہا ہے وہ شمالی ہند کے ادبی حلقوں میں شرفِ

قبولیت پاسکے گی۔ غیر شعوری طور پر وہ بہت سے ایسے الفاظ اور قواعد کی شکلیں لکھ جاتا ہے جنھیں وہ ولیؔ کی روایت شعر کے مطابق سمجھتے ہوئے شمال اور دکن دونوں مقامات کے محاورے کے مطابق سمجھتا ہے۔ اور یہ اُسی پر کچھ نہیں موقوف ، دہلی کے متقد مین شعرائے اردو آبرو ، فائز ، حاتم ، ناجی اوریک رنگ کب ولیؔ کے لسانی اثرات سے محفوظ رہے حالانکہ ان میں سے کسی نے اپنے زندگی کے ایاّم دہلی کے باہر نہیں گزارے تھے۔

سترھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے عہد عالمگیری کے ایک اور مصنف شاہ سید برکت اللہ پمیؔ مارہروی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان کے ہندی کلام کا مجموعہ " پیم پرکاش " (سنہ تصنیف ۱۶۹۸ ء) کے نام سے شائع ہوچکا ہے ۔ اس میں زیادہ تر' دوہے ' اور 'کبت ' ہیں جو روایتی "زبانِ شعر' برج میں لکھے گئے ہیں ۔لیکن شاہ صاحب نے بہ مقتضائے زمانہ چند " ریختے" بھی لکھے جو صاف اس زبان میں ہیں جو افضلؔ کی بکٹ کہانی میں استعمال کی گئی ہے۔

گھر تج کے جا جنگل میں پری تب سمجھ پری
تن من میں پیم کی آگ بری تب سمجھ پری
موجوں کے پھیر کو جو دل غیر بوجھتا
جب سندھ کے بھنور میں پری تب سمجھ پری
تکیہ جو مخملی و دگر سیج چھوڑ کے
جب اینٹ زیرِ سیس دھری تب سمجھ پری
جِت تِت پھرے سے من کو تسلّی نہ کچھ بھئی
جب دل کی کیل مانجھ اَری تب سمجھ پری
کنجِ خفی میں وصل ہوئی فکر و غم نہ تھا
جب ہیّا میں لگائی چھُری تب سمجھ پری
بوجھا نہ عشق بازِ خرد ، راہ پیم کا
جب عشق سُدّھ بُدھّ ہری ، تب سمجھ پری

شاہ پمیؔ کا مذکورہ بالا ریختہ برج کے لہجہ کے باوجود (پری پڑی)، اری (اڑی) جِت تت، ہری کھڑی کے سانچے میں ہے۔ ان کے ریختوں کا تجزیہ کیجئے تو وہ زبان کے حسبِ ذیل مرکبات کی شکل میں ملتے ہیں :

(۱) کھڑی بولی + عربی فارسی الفاظ
(۲) برج بھاشا + فارسی کے مصرعے /نصف مصرعے
(۳) کھڑی بولی + فارسی کے مصرعے / نصف مصرعے

ان ریختوں کے لیے غزل کی ہیئت استعمال کی گئی ہے یعنی مطلع ہے، قافیے ردیف کا التزام ہے اور آخر میں مقطع ہے، بحر بھی اردو فارسی کی ہے۔ ایک ریختہ مستزاد میں بھی ہے۔

۱۷۰۰ء تک ریختہ کی شکل میں کھڑی بولی اردو کا ادبی ارتقا ہوچکا تھا۔ شاہ جہاں کی ۱۶۴۸ء میں آگرے سے دہلی واپسی کے بعد 'زبانِ دہلی' کو مہمیز لگتی ہے لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد اورنگ زیب 'فتوحات دکن کی تکمیل کے لیے دارالسلطنت کو عملی طور پر اورنگ آباد لے گیا اور زندگی کے آخری بیس پچیس سال وہاں اس طرح گزارے کہ ۱۷۰۷ء میں دکن ہی کی خاک کا پیوند ہوگیا۔ اس کی فتح بیجاپور (۱۶۸۶ء) اور گولکنڈہ (۱۶۸۷ء) کے بعد دکن اور شمال کے منقطع تہذیبی رشتے ایک بار پھر استوار ہوگئے۔ ولیؔ اورنگ آباد سے چل کر ۱۷۰۰ء میں دہلی آئے۔ سراجؔ اورنگ آبادی اور اسمٰعیل امروہوی جیسے سیکڑوں خاندان اور اشخاص اورنگ آباد جاکر بس گئے یا طویل مدت وطن سے دور وہاں ملازمت میں گزاری۔ اس زمانے میں اورنگ آباد اور شاہ جہاں آباد (دہلی) میں ادباء اور شعرا کی اس قدر آمدورفت تھی کہ لسانی اعتبار سے اورنگ آباد دہلی کا ایک محلّہ سا معلوم ہوتا تھا۔ کچھ تعجب نہیں کہ دہلی کے متقدمین نے بار بار 'ریختے' اور 'معشوقِ دکن' کا ذکر کیا ہے۔

دکھنی پسر کے زخم حمائل کوں سرکٹا
بولا کہ میں کُتا ہوں تیرا اور گلے پٹا (آبرو)

خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ گوئی کے
معشوق جو ہے اپنا باشندہ دکن کا تھا (میر)

آیئے اب ہم اس 'دکھنی پسر' اور 'باشندہ دکن' کی زبان کی جانب رجوع کریں جس نے ۱۷۲۰ء میں ولیؔ کے دیوان کی آمد کے بعد 'شاہجاں آباد' کے ایوانوں اور گلی کوچوں میں تہلکہ سا ڈال دیا تھا۔

دکن میں اُردو (۱۳۰۰ تا ۱۷۰۰ء)

تاریخی پس منظر

پچھلے صفحات میں، دستیاب لسانی مواد کی روشنی میں اردو زبان کے ارتقا کی تاریخ کا ایک خاکہ پیش کیا جاچکا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم شمالی ہند میں اردو کی داستان کا سِرا ۱۷۰۰ء کے بعد اٹھائیں، بہتر ہوگا اگر یہ دیکھیں کہ اس زبان پر، وطن سے دور ملک دکن میں کیا گذری۔ فتوحاتِ دکن کا سلسلہ فتحِ دہلی (۱۱۹۳ء) کے سو برس بعد علاء الدین خلجی کی فتوحات سے ۱۲۹۵ء میں شروع ہوتا ہے اور ۱۳۱۶ء یعنی اس کی وفات تک جاری رہتا ہے جب کہ اس کا سپہ سالار ملک کافور اس کا عَلَم مدورائی اور تنجور تک پہنچادیتا ہے۔ اس کا داخلۂ دکن دولت آباد سے شروع ہوتا ہے جو مراٹھی کے علاقے میں واقع ہے۔ اس کے بعد ورنگل کی نوبت آتی ہے، جو تلگو کا علاقہ ہے

اس کے بعد کنڑ اور تمل زبانوں کے علاقے اس کی زد میں آجاتے ہیں اور خسرو کے ، دھورسمندر اور ،معبر، تک ترک شہسواروں کی گِرد سمند پہنچ جاتی ہے، اس طرح کہ دکن میں " ترک " مسلمان کا مترادف ہوجاتا ہے اور ان کی دہلی سے لائی ہوئی زبان " ترکاماٹا " (مسلمانوں کی بولی) بن جاتی ہے۔

شاہانِ دہلی کا دکن سے شغف اس قدر بڑھ جاتا ہے اور وہاں کا " ہُن " اس قدر عزیز ہوجاتا ہے کہ ۱۳۲۷ء میں محمد بن تغلق نے یہ ضروری سمجھا کہ اپنا دارالسلطنت تغلق آباد (دہلی) سے منتقل کرکے دولت آباد لے جائے۔ ہر چند سیاسی سطح پر یہ تجربہ 'دیوانگی' کے مترادف رہا لیکن اس کے ادبی ولسانی نتائج بہت دوررس ثابت ہوئے اور خسرو کی "زبانِ دہلی" دکن کے دور دراز علاقوں میں فاتحین اور رابطے کی زبان کی حیثیت سے پھیل گئی۔ ۱۳۴۷ء میں دکن کے امیرانِ صدہ نے (جو شمال سے گئے ہوئے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے) سلطنت دہلی کے خلاف بغاوت کی اور دوسال کے اندر علاء الدین بہمن شاہ کی قیادت میں ایک خود مختار ریاست یعنی سلطنت بہمینہ کی داغ بیل ڈال دی ۔ اس کا مرکز پہلے دولت آباد (مراٹھی کے علاقے میں) رہا لیکن بہت جلد منتقل ہوکر گلبرگہ (کنّڑ کے علاقہ کا شہر)بنادیا گیا ۔ رفتہ رفتہ گولکنڈہ اور تلگو بولنے والے دیگرعلاقے بھی بہمنی سلاطین کے زیرنگیں آگئے ۔ اس طرح "زبانِ دہلی" جو یہاں ہندی، ہندوی کے ناموں سے یاد کی جاتی تھی تین زبانوں (۱) مراٹھی (۲) کنّڑ اور (۳) تلگو کے علاقوں پر فاتحین کی زبان کی حیثیت سے مسلّط ہوگئی ۔ ان تینوں زبانوں میں سے مراٹھی کا تعلق ہندوستان کے ہند آریائی خاندانِ السنہ سے ہے جس سے ہندی (زبانِ دہلوی) کا بھی تعلق ہے ۔ خاندانی مماثلت کی بنیاد پر مراٹھی سے اچھا لین دین رہا ۔ مراٹھی نے بہت سے عربی فارسی کے الفاظ (بالخصوص عدالتی ، انتظامی اور درباری) قبول کیے اور مراٹھی سے پراکرت کے ایسے الفاظ جن کے سر رشتے شمالی ہند کی بولیوں سے جاملتے تھے بآسانی ، زبان دِہلی ، میں آمیزش کرلیے گئے ۔ کنّڑ اور تلگو زبانوں کا تعلق دراوِڑ (دراویدی) خاندانِ السنہ سے ہے جو ہند آریائی سے بالکل مختلف ہے ۔ لہٰذا ان زبانوں سے بہت کم لین دین ہوسکا ۔ بول چال کی زبان سے قطع نظر تحریری زبان میں بہ مشکل چند الفاظ محاورات کی نشان دہی کی جاسکتی ہے ۔ اس لیے مراٹھی کے علاقے میں زبانِ دہلی میں جو تبدیلیاں ہوگئی تھیں (مثلاً " چ" تاکیدی ، حرفِ نفی "نکو"یا بعض پراکرتی الفاظ) ، اسی شکل میں ہندی / ہندوی کے نام سے یہ زبان ان علاقوں میں پھیل گئی۔ ابتدا میں صرف شمال سے آئے ہوئے خاندان ا سے گھریلو زبان کی حیثیت سے استعمال کرتے تھے۔ سلطنت بہمنہ کی سرکاری درباری زبان فارسی رہی نچلی انتظامی سطحات پر مقامی زبانوں کو بھی استعمال کیا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ دہلی کے سرچشمے سے دور ہوجانے کے بعد اور فارسی زبان کے ان علاقوں بہت محدود پیانے پر استعمال کی وجہ سے ، اوّل اوّل صوفیہ نے اپنی تلقین کے لیے "ہندی "کو وسیلۂ اظہار بنایا اور مذہبی اور صوفیانہ موضوعات پر نظم ونثر میں چند رسائل تصنیف کیے۔ انھیں میں ایک رسالہ " معراج العاشقین " ہے جو عر صے تک خواجہ بندہ

نواز گیسو دراز سے منسوب رہا۔ اردو زبان کے پہلے نمونہ کی حیثیت سے بہت شہرت پاگیا تھا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ لسانی تجزیہ کے نقطۂ نظر سے پہلی " مخطوط بنیاد" تصنیف جس سے ہم دوچار ہوتے ہیں فخردین نظامی کی " مثنوی کدم راؤپدم راؤ " ہے جو ۱۴۲۱ ء اور ۱۴۳۵ ء کے درمیان کی تصنیف ہے یہ غالباً بیدر میں لکھی گئی ہے اس لیے کہ احمد شاہ ولی نے گلبرگہ کی طرح بیدر بھی کنڑّ کے علاقے میں ہے لیکن سرحدی شہر ہونے کی وجہ سے اس علاقے میں مراٹھی کے اثرات ہمیشہ نمایاں رہے ہیں ۔ " مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" میں اردو زبان کا جو چہرہ ابھرتا ہے وہ تیرھویں صدی عیسوی کی زبانِ دہلوی کا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ شمال میں اس زبان کے مستند نمونے نہیں ملتے ۔ شمال میں پہلا مستند نمونہ افضلؔ کی بکٹ کہانی میں ملتا ہے جو نظامی کی مثنوی کے دو سو سال بعد کی تصنیف ہے ، جس وقت دکن میں دکنی اردو محمد قلی قطب اہ، وجہی، غواصی اور عبدل کے ہاتھوں ادبی اور لسانی دونوں اعتبار سے اپنے بامِ عروج کو پہنچ چکی تھی ۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اس زبان میں لکھی گئی ہے جب ابھی اردو پر پرکرات کے قدیم الفاظ کی چھاپ گہری تھی ۔ شمال میں ان بولیوں کی آنکھ مچولی بالآخر ایک میعاری زبان کی شکل اختیار کرتی گئی اور پراکرت کی ڈگر سے فارسی کی روش پر آتی گئی ۔ دکن میں بولیوں کا تازہ خون نہ ملنے کی وجہ سے اس زبان میں ایک طرح سے جمود اور یکسانی سی آگئی ۔ فارسی کے بھی سرچشمے دور تھے اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ سترھویں صدی کے بعد اس کی کیا صورت ہوتی کہ زبانِ دہلوی اپنی نئی شکل میں عالم گیر کے لشکروں کے ساتھ آن دھمکی اور رفتہ رفتہ دورِ آصف جاہی میں اردو کی جدید شکل اس کی قدیم شکل کی جگہ لیتی چلی گئی ہر چند بول چال کی زبان میں قدیم اردو (دکنی) کے محاورے کا اب تک چلن ہے ، بلکہ اسکی بعض شکلیں مثلاً " یا" سے مرکب ماضی (چلیا، پڑیا ، ہلیا) جو حیدرآباد کی اردو سے معدوم ہوگیا ہے دکن کے دور دراز اور دور افتادہ علاقوں میں آج تک سنائی دیتا ہے۔

نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (۱۴۲۱ تا ۱۴۳۵ کے درمیان کی تصنیف) کے علاوہ لسانی تجزیے کے سنگِ میل کے طور پر ہم نے خاص طور پر حسبِ ذیل کتب کا انتخاب کیا ہے۔

(۱) اشرف بیابانی : نوسرہار (۱۵۰۳ ء)

(۲) محمد قلی قطب شاہ : کلیات (م : ۱۶۱۱)

(۳) کلمتہ الحقائق : برہان الدین جانم (قبل ۱۵۸۲ ء)

(۴) عبدل : ابراہیم نامہ (۱۶۰۳ ء)

(۵) وجہی : قطب مشتری (۱۶۰۹ ء)

(٦) غواصی : کلیات اور سیف الملوک وبدیع الجمال (۱٦۲۵ ء)

(۷) وجہی قطب مشتری (۱٦۰۹ء) اور سب رس (۱٦۳۵ ء)

(۸) ابنِ نشاطی : پھول بن (۱۶۵۵ ء)

(۹) نصرتی : گلشنِ عشق (۱۶۵۷ ء)

(۱۰) نصرتی : علی نامہ (۱۶۶۵ء)

اس بنیادی کتب کے علاوہ دکنی اردو کے وافر ذخیرے سے ضرورت کے مطابق مزید مثالیں لے کر درج کی گئی ہیں۔

صَوتی خصوصیات

(۱)تخفیفِ مصّوتہ، یعنی بڑے مصوتوں کو چھوٹے مصوتّوں میں بَدل دینا مثلاً

اَسمان (= آسمان) ع نہ ہُیں پرد سے اور نہ اَسما ن میں (ق م)

ہَتّ (=ہات) ع کنگن ہتّ کیا دیکھناں آرسی (ک پ)

ہَت (=ہات) ع چلی لے کے چھب سوں پکڑ ہت میں ہات (گ ع)

بُند (=بوند۔ س ر)، بدل (=بادل، ک م ق ق)

اَنچل (=آنچل، ک م ق ق)، سُرج (=سورج، ان)

گھنسّ (=کھانسؔ، ک م ق ق)، پرت (=پریت۔س ر)

پُھل (=پھول۔س ر)، چھلے (= چھالے۔ س ر)، سُنا (= سونا۔ س ر)

گنگے (=گونگے۔س ر)، گھنگھٹ (=گھونگھٹ ۔ س۔ر)، ہتھی (= ہاتھی۔س ر)

(۲) تطویلِ مصّوتہ یعنی چھوٹے مصّوتوں کو بڑے مصّوتوں میں بدل دینا، مثلاً

کال (=کل) ع نہ گھال آ ج کا کام توں کال پر (ک پ)

آپنا (=اپنا) ع سکھی آپنا جیو تو سب جہان (ک پ)

سا چ (=سچ، ک پ)، پاتھر (= پتّھر، ک پ)

ماٹی (ک پ، ن ہ)۔ یہ لفظ دکنی اردو میں مسلسل اسی طرح آیا ہے)،

پہار (=پہر، ن ہ)، لاگا (ن ہ) ناہیں (ن ہ)، لوہو (ن ہ)،

کوتا(= کتّا، ک پ) چھوپی (= چھُپی س ر)، جاگا (=جگہ، س ر)

چاکھنا (س ر)، موٹھی (= مٹھی۔ س ر)، چت کا برا (= چتکبرا۔ س ر)

(۳)مصوتوں کا انفیانا

دکنی اردو اور شمال کی قدیم اردو کا یہ نہایت قوی رجحان رہا ہے جس کی با قیات اب تک شمالی اردو کی بول چال میں پائی جاتی ہے۔

بولنان ع سوبولیا تجھے و نہ تھا بولناں (ک پ)

بونٹی ع نہ جھاڑی نہ بونٹی ڈرے باؤکوں (ک پ)

توں(ن ہ)، کوں (ن ہ) ،سپناں (ن ہ) تیں (س ر) پیچھیں (س ر)،کونْچے کونْچے (س ر)،مُنج (=مج۔ س ر)

(۴)انفیت کا حذف : جو مذکورہ بالا رجحان کے بالکل برعکس ہے

ما (= ماں۔ س ر)، کو آ (=کنواں۔ س ر) ، موچھیاں (= موچھیں۔ س۔ ر) ، گوانا (=گنْوانا۔ س ر)

(۵) الف مکسورہ (مصوّتہ)کا تلفظ دراویدی صوتیات کے تحت (ی) کیا جاتا ہے۔ یہ بول چال کی دکنی اردو میں عام ہے جیسے یم۔ یے (=ایم۔ اے)تحریری دکنی اردو میں بھی مل جاتا ہے۔ یکیلے (=اکیلے۔ س ر) ، تیا (اِتا بمعنی اتنا۔ س ر) ییک (= ایک۔ س ر)

(٦) نفَسَیت (ہکاریت) کا حذف

چڑنا (=چڑھنا۔ س ر) دُھونڈنا (=ڈھونڈھنا۔ س ر)

سوکا (=سوکھا۔ س ر) ، انجو (=انجھو۔ س ر) ، ابی (=ابھی۔ س ر)

انگوٹی (=انگوٹھی۔ س ر)، باندنا (=باندھنا۔س ر) ، بی (=بھی۔ س ر)

پرکنا (= پرکھنا۔س ر)، تماری (= تمہاری۔س ر) پگتا (=پگھلتا۔ س ر)

(۷) نفَسَیت کا اضافہ :

الٹھانا (=الٹانا) " ایک بادشاہی کو الٹھانا ہے " (س ر)

سنگھاتی (=سنگاتی)" ہمت مرداں کی سنگھاتی " (س ر)

پھترّ(=پتّھر۔ س ر) ، پھنکڑیاں (=پنھکڑیاں۔ س ر)

جگھڑا (جھگڑا۔ س ر)

(۸) کوز آوازوں کو دندانی میں تبدیل کردینا

جب ایک ہی لفظ میں دو کوز آوازیں آتی ہیں تو پہلی دندانی بن جاتی ہے۔

دُھنڈنا (=ڈھونڈھنا۔ س ر)۔ تُٹنا (= ٹوٹنا۔ س ر)

دانٹنا (= ڈانٹنا۔ س ر) ، دھنڈورا۔ س ر)

داڑھی (=ڈاڑھی۔ س ر)،

۹) دکنی اردو کی ایک مسلسل صوتی خصوصیت (شمال میں بھی یہ گا ہے گا ہے مل جاتی ہے)

" ق"کا " خ" میں تبدیل کردینا ہے۔ اس کا الٹا بھی بول چال میں سنائی دیتا ہے یعنی ، خبر، کا ، قبر، لیکن

تحریرمیں نہیں ملتا۔ مثالیں اَخَل (=عقل۔ س ر)، خطرہ (=قطرہ۔س ر)

صرفی خصوصیات :

(الف) اسمِ کیفیت : دکنی اردو میں اردو کے متداول اسمائے کیفیت کے علاوہ کچھ مخصوص شکلیں بھی ملتی ہیں :

(۱) مرکب بہ اسم : بھائی پنا (س ر)، دشمناگی (دہ)

(۲) مرکب بہ صفت : کڑوائی (=کڑواہٹ) (س ر)، کڑواس (کڑواہٹ) (دہ)، نرمائی (=نرمی) (پھ ب)

(۳) فعل سے مرکب : چلنت (س ر)، بِسراٹ (بسرنا سے) (دہ)

(۴) یائے زائدہ کے ساتھ : خوشبوئی (س ر)

(ب) اسم ظرف : دُھپ کالا (موسمِ گرما) (ک م ق ق)، ٹھنڈ کالا (دہ)۔

جنس :

(۱) بعض اسم جو موجودہ اردو میں مونث ہیں دکنی اردو میں مذکر لکھے گئے ہیں

ندا (ت ف)، دعا(ک م ق ق)، راہ (س ر) پھ ب) بستی(ک م ق ق)، بلندی (ک م ق ق)، مہکار(ک م ق ق)،جھلکار(ک غ)، لذّت (س ر)، دولت (پ گ)، فراغت (س ر)، ضیافت (س ر)، محبّت (ک غ)، عداوت (س ر)، راحت (س ر)، عزّت (س ر)، فراست (پھ ب)، نیت (س ر)، تاب (ک م ق ق)، آس (ک م ق ق)، جان (س ر: قدماء تک یہ مذکر رہا ہے)، عمر(ک غ)، آواز(پھ ب)، بو (پھ ب)، عید (ک م ق ق)، مدد (ک غ)، حمد(پھ ب)، داد (ک ب)، چھاؤں (پھ ب)، بَھوں (ک غ)، تعبیر (پھ ب)، تدبیر (پھ ب)، تحریر (پھ ب)، تعریف (پھ ب)، حدیث (س ر)، نماز (س ر)، شرط (س ر)، بات (س ر)، تاثیر (پھ ب)، درگاہ (س ر)، عیدگاہ (گ ع)، تخت گاہ (گ ع)، بزم گاہ (گ ع)، خواہش (گ ع)، تابش (ک غ)، (دہ)، مجلس (ک م ق ق)، مسجد (دہ) ہوس (س ر)،

(۲) بعض معروف اسماء دکنی اردو میں مذکر، مونث دونوں طرح استعمال کئے گئے ہیں، اکثر ایک ہی شاعر نے دونوں طرح باندھا ہے۔

غزل : (مذکر) ع غواصی صاف باتاں سوں سراسر یو غزل تیرا (ک غ) (مونث) ع جو میں غواصیؔ مِٹھی یو غزل کھیا سوسُن (ک غ)

خنجر : (مذکر) ع ستم کا گر ننگا خنجر جو ہوگا (پھ ب)

(مونث ع تیری خنجر جو ہے ووجھِل جھِلائی (پھ ب)

(۳) بعض اسماء جو موجود اردو میں مذکر ہیں دکنی اردو میں مونث ملتے ہیں :

مقصود (س ر) ، ذکر (س ر) ، ادب (س ر) ناؤں (= نام ، س ر) ، خواب (س ر)

تعداد :

(ا) اردو میں ایسے واحد مذکر اسماء جن کے آخر میں "الف" یا " ہ " نہ ہو ان کی واحد جمع دونوں میں یکساں صورت رہتی ہے ۔ اس کے برخلاف دکنی اردو میں ان کی جمع (۔ اں) سے بنائی جاتی ہے جمع کا یہ قاعدہ فارسی اور پنجابی میں بھی مستعمل ہے لیکن دکنی اردو نے (۔ اں) کی جمع کا قاعدہ ہریانوی سے لیا ہے جو نواحِ دہلی کی ایک بولی ہے ۔ نظامی تانصرتی ، (ہر چند جمع بنا نے کے دوسرے قاعدے کھڑی بولی کا (۔وں) اور برج بھاشا کا (۔ن) بھی دکنی اردو میں ملتے ہیں) جمع بنا نے کا یہ قاعدہ دکنی اردو کی صرفی سطح پر سب سے بڑی شناخت ہے ۔ اس قاعدے کا ا طلاق عربی الاصل اور ہندی نژاد دونوں قسم کے اسماء پر ہوتا ہے۔

چیلاں (ک پ) ہاتاں (ن ہ) ۔ لاچاں (ن ہ)

عابداں (ک م ق ق) ۔ مالیاں (ک م ق ق) خیالاں (ک م ق ق)

عورتاں (س ر) ، باتاں (پھ ب) (س ر) ۔ دلاں (س ر)

آنکھیاں (س ر) موتیاں (س ر) ، کتاباں (س ر) ، لوگاں (س ر)

(۲) (۔ اں) کی جمع کے علاوہ خال خال دکنی اردو میں برج بھاشا کی (۔ ن) سے مرکب جمع بھی ملتی ہے ۔

ع ہاتن کھانڈے ترکش باند (ن ہ ، شعر ۹۱۷)

ع پھولن باڑی کمھلائی (شعر ۳۰۸)

ع ہاتن کھویا گھرکی جوئے (ن ہ ، شعر ۴۸)

ع دوکھن سیتی بان بکھر (شعر ۳۰۷)

ع ہاتن مانک کھویا واہ (ن ہ ، سعر ۴۶)

(دکنی اردو میں (۔ن) سے مرکب جمع کا استعمال بہت کم ہوا ہے اور وہ بھی برج بھاشا کے زیر اثر صرف مخصوص الفاظ کے لیے ۔ یہ جمع نوسرہار میں کثرت سے ملتی ہے)

(۳) جدید اردو کی (۔وں) کی جمع جس کا سر چشمہ کھڑی بولی ہے ، دکنی اردو میں بہت کم ملتی ہے ۔ مثال :

ع کھلے تھے پھول جھاڑوں پر ہر اک ٹھار (پھ ب ، ص ۳۸)

اسمائے ضمیر:

(۱) ضمائر متکلم

فاعلی حالت : مَیں ، ہوں ، اپے ہم ، ہمن ، ہمنا ، ہمے ، ہمیں

مفعولی حالت : مجے ، منجے ، مج ، منج ، منج کوں ، مجہ ہمنا ، ہمنا کوں

اضافی حالت : مو، مج، مجھ، منج ، میرا ہمن ، ہمارا

ہَوں (= مَیں) ع نہ نا یک ڈروں ہوں نہ پایک ڈروں (ک پ ، شعر ۸٦) ع پیارے نہ کر کھینچ ہوں تو پہ واری (ک م ق ق ،ص ٦۲ ، حصّہ سوم) (محمد قلی قطب شاہ کے وقت تک برج کا " ہُوں " صرف ریختیوں کی زبان میں رہ گیا تھا۔ یوں بھی اس کا استعمال ،مَیں ، مقابلے میں بہت کم رہا ہے)

اَپے : " جو نماز کوں جائے تو یو جاننا کہ اپے خدا کے حضور میں جاتا ہوں " (س ر)

ہمن (ہمارا) (ک پ) ہمن (ہم) (پھ ب) ہمنا (= ہم) " ہمنا تمنا میں کیا جدائی ہے " (س ر) ہمیں (= ہم) ہمیں تم مل کر جائیں گے "(س ر) منجے (ک غ) مجہ (پھ ب) ہمنا (ک م ق ق)، ہمنا (س ر)

مو (= میرا) (ک م ق ق) مج (میرا (پھ ب) منج (میرا) (ک م ق ق) ہمن (ہمارا) (ک م ق ق)

(۲) ضمائر مخاطب

	واحد	جمع
فاعلی حالت :	تو، توں ، تیں ،	تم ، تمن ، تمنا ، تمہیں
مفعولی حالت :	تج ، تجے	تمن، تمہیں، تمنا کوں
اضافی حالت :	تو، تج ، توج ، تجھ ، تیرا	تم ، تمن ، تمنا ، تمارا

توں (=تو، ن ہ)، تمن (= تمہارے ، ک پ،ک م ق ق) تمن (= تم ، ک م ق ق)، تم (تمھاری ،ک م ق ق) تج (تجھے، ک م ق ق) ، تج (تیری ، گ ، ع) تمنا کوں (دہ) ، تمنا (=تمھارا (دہ) ، تمنا (=تم ، " ہمنا تمنا میں کیا جدائی ہے " (س ر) تو (=تیری، ک م ق ق) تَیں (=تو، ک پ ، ع رتن تھیں اَدھک تیں کیا مکھ بچن)

(۳) ضمیرِ غائب

	واحد	جمع
فاعلی حالت :	وہ، وو ، وُ ، اُو ، اُنے	اُن ، انو ، وے
مفعولی حالت :	اُس ، اُس کوں ، ا سے	انوں کوں ، اپنوں کوں

اضافی حالت :	اس کا	انوکا ، اینوکا ، وِن کا

او (=وہ، ک ب) اُنے (= وہ ، س ر " اُنے سب جاینا " دہ) دے (وہ کی جمع ، دہ) اُن (وہ جمع ، ک ب)

انو (= وہ جمع ، س ر " غیب کے پردے انوں کیوں کھولتے ")

اُس (=وہ ک م ق ق) ، انوکا (=اُن کا ، س ر)

انوں کوں (=اُن کو، س ر) دِن کی (=اُن کی ، ک م ق ق)

اَپن (=اپنا ، ک م ق ق) اَپس (=اپنا ، گ ع)

اپے (= آپ ہی ، ک ع) (پھ ب)

(۴) ضمیرِموصول

	واحد	جمع
فاعلی حالت:	جو، جے ، جن نے ، جنے	جن ، جنو ، جنوں
مفعولی حالت :	جسے ، جس کوں	جنوں کوں ، جنوکوں
اضافی حالت :	جس کا	جنوں کا

جے = جو ع کہ جَے بولنا ہوئے نہ بول وو (ک پ ، شعر ۸۶)

ع جے تو کیتی پھر یہ بات (ن ہ ، شعر ۳۹)

ع جے کچھ منگوں تج پاس تھے سو ہے سو منج کوں توں دیا (ک م ق ق) (جو ، جن ، جنے کے مقابلے میں اس استعمال کم تر ہے)

جنے (=جو)(ک م ق ق) (س ر) " جنے سینا اُ سے گھائل ہونا ہے "

جن (=جو) (ک م ق ق)

جِنو (=جمع جو) " اس کے فرمائے پر جنو چلے (س ر۔ ص ١٦)

(موجودہ اردو میں " جو " فاعلی حالت میں واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ دکنی اردو میں واحد جو ، جے جن ، جنے ہوتا ہے جمع کے لیے جِنو اور جِنوں آتا تھا)

(۵) ضمیرِاستفہام

	واحد	جمع
فاعلی حالت :	کون ، کِن ، کِنے ، کو	کِن
مفعولی حالت :	کس ، کس کوں ، کسے ، کس نے	کِنے کوں
اضافی حالت :	کس کا	کِن کا

کِن (=کون) ع بجانوں لے قلم کِن خوش نویس آ ج (ک غ)
کِنے (=کون) ع کِنے بے رحم باند یا تج پلو آگ (پھ ب)
کوُ (=کون) ع یاقوت ہوا مرجاں میں کو ہے رتن برتر کہو (ک ش)

(٦)ضمیرِاشارہ

ضمیرِ اشارۂ قریب

(١) یو (=یہ) "لھوے تے یو تخت و تاج آیا" (س ر)

(٢) اِے (=یہ) ع گیا آواز سو آسمان میں اے (پھ ب۔ ص ١٣٤)

(٣) ایہہ (=یہ) ع ہرا کر ڈگر ایہہ کدم رائے آئے (ک پ۔ شعر ١٠٨)

(٤) یے (یہ جمع) ع یے رقیباں دیکھ کر دکھ تھے کیے، آپ جیو پرخست

(٥) ان (=اِس) "اِن آبِ حیات نے اُس آبِ حیات کا رکھیا لاج" (س ر)۔

(٦) اِنے (اس نے) "انے پکڑیا تھا خاموشی (س ر)

(٧) اِنوں (اِن کو) "اِنوں کوکاں کا آرام" (س ر)

ضمیرِ اشارۂ بعید

وو (وہ) "وہ ہمیشہ کھڑا" (س ر)

اُنن کے (اُن کے) (ک م ق ق)

اُنوں کوں (=اُن کو) (س ر)

(٧)ضمیرِتنکر

فاعلی حالت: کوئی، کُئی، کُچ، کوچ

مفعولی حالت: کسی کوں، کن کوں

اضافی حالت: کسی کا، کسی کے

کُئی (=کوئی) ع جو کُئی ہے باغباں اس پھول بَن کا (پھ ب) (اس کا عام املا "جکئی" تھا)

کُچ (=کچھ) ع نہ آوے گنج قاروں کام کچ تج حسن کا گنج ہے (ک م ق ق) (اس کا املا کوچ بھی ملتا ہے)

جیکو(جو کوئی) ع جیکو چڑے گھوڑے اُپر اس کوں سواراں میں گِنن (ک م ق)

(جو کوئی اور جیکوئی بھی ان معنوں میں مستعمل تھا)

فعل :

(۱) اردو میں علامت مصدر " نا " ۔ دکنی اردو میں اسکی انفی شکل (ناں) بھی ملتی ہے :

ع سوبولیا تجھے جو نہ تہا بولناں (ک پ، شعر ۱۲۶)

کھولناں (ک پ، شعر ۱۲۶)، کرناں (ک پ، شعر ۵۰۷)

برج بھاشا کی علامت مصدر (۔ ن) سے مرکب افعال بھی مل جاتے ہیں ۔ نو سرہار میں اس کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں :

ع نہ مر جاؤ توں چھوڑا وگن کرن (ک پ، شعر ۵۹۶)

ع ڈھونڈن لاگے کدھرے ٹھار (ن ہ، ۔ شعر ۵۶۷)

ع رہن لاگے خوشی سات (ن ہ، شعر ۵۹۰)

ع اَوٹن لاگا کس کس دھات (ن ہ، شعر ۶۱۲)

ع برہ کی گرہ دل تے کھولن لگی (گ ع ۔ ص ۲۶۱)

یہ مصدر(و) کے اضافے سے بھی بنایا جاتا تھا ۔

پڑھاون (=پڑھانا) (ک ۔ پ، شعر ۵۸۵)

جاونا (= جانا) ع نہیں ہے حاجت اے جاونے کوتا بہ حجاز (ک م ق ق)

آؤنا (ک ب، ص ۱۶۲)

پیونا (ک ب، ص ۱۶۲)

(۱) دکنی اردو کے فعل ناقص موجودہ اردو سے خاصے مختلف ہیں ۔ یہ عموماً اس شکل میں آتے ہیں : ہے، اہے، ہیں، اہیں، تہا، اتہا، تہی، اتہی، تہے، اتہے، تہیاں، اتہیاں

اہے (ہے) : ع جہاں جکچہ ہے وہاں سب اہے ظہور اُس کا (س ر)

اہیں (ہیں) : ع جکوئی تج محبت کے ماتے اہیں (گ ع)

اتہا (تہا) : ع اتہا دل صاف تس کا جوں کہ درپن (پھ ب)

ع اتہا تونچ اوّل ہور آخر تہینچ (گ ع)

اتہی (تہی) ع نہ بیٹا اسے ایک بیٹی اتہی (چ م)

اتہے (= تہے) : ع گھڑی یک یکس نہ رہتے اتہے (گ ع)

تہیاں (= تہیں) : " جو باتاں خداکوں بھاتیاں تہیاں،

سو باتاں دلیچ میں تے آیتاں تہیاں (س ر)

ع انو کے کنے بھی اسی دھات تہیاں (گ ع)

اتھیاں (= تھیں) : ع اتھیاں خوبصورت چھبیلیاں جتیاں (چ م)

(۲) دکنی اردو میں ماضی مطلق کے لیے علامت مصدر ، نا ، گرانے کے بعد زیادہ تر " یا " لگایا جاتا ہے ، جو ہر یانوی کی بھی تخصیص ہے ، دکنی اردو کی یہ مسلسل خصوصیت رہی ہے :

اٹھیا (= اٹھا) ع گیا راجہ تج جب اٹھیا بول یہ (ک پ)

رہیا (ک پ ، ص ۱۱۵) ، کہیا (ک پ) رکھیا (س ر) ، دیکھیا (س ر)

" لشکر اپنا سب دیکھیا ، لشکر کی گنتی ہمت کریا (س ر)

شاذ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کلاسیکی دکنی اردو میں بھی " ا " کا ماضی مطلق مل جاتا ہے ۔ جیسے "

قامت جو نظر کو رقیب کے سنگات دیکھا (س ر)

ع چھپا سیمرغ جا کوہ قاف میانے (پھ ب ۔ ص ٦٨)

بعض اوقات علامتِ مصدر گرانے کے بعد اگر خاتمے پر مصوتہ رہ جائے تو " ء ی ا " کا اضافہ کیا جاتا ہے

ع مبارک باد دینے آئیا نوروز تج دوبار (ک م ق ق)

(۳) دکنی اردو میں ایک فعل " کتیا " بھی نظامی تانصریي مسلسل استعمال ہوتا آیا ہے بلکہ یہ شمالی ہند کی قدیم اردو تک میں رائج تھا ۔ فعل کی یہ شکل کبھی ماضی مطلق کے لیے استعمال ہوتی تھی اور کبھی حال مطلق کے لیے ۔

کیتا (=کیا) ع سو کیتا ابتدا تعظیم کا سَطُر (پھ ب)

کیتا (= کرتا ہے) ع معطَر اس سوں کیتا ہے چمن کوں (پھ ب)

(۴) ماضی احتمالی

دکنی اردو میں ماضی احتمالی کے لیے ماضی مطلق کے بعد " اچھے گا " یا " اچھے گی " کا اضافہ کیا جاتا ہے (اچھنا = ہونا)

" تاراں کی زنجیراں سوں جکڑ کر جان گیا اچھے گا " (س ر)

" جدہاں تے جو کوئی دنیا میں آیا اچھے گا عجب ہے جو کوئی ایسا دغا کھایا اچھے گا " (س ر)

(۵) فعل حال

معیاری اردو کے مانند دکنی اردو مصدر سے علامت " نا " حذف کرنے کے بعد " تا " لگا کر فعل حال بنایا جاتا ہے ۔ لیکن کبھی بھی برج کے زیر اثر صرف " ت " کے اضافے سے بھی بنالیا جاتا ہے :

ع اَدھر تیرے کوثر کا پیالہ پلات (ک م ق ق)

سُنات (ک م ق ق) (یہ شکلیں محمد قلی قطب شاہ سے مخصوص ہیں)

دکنی اردو میں (شمالی ہند کی قدیم اردو کی طرح) حال مطلق بنانے کا ایک قاعدہ یہ بھی رہا ہے کہ مضارع

کے بعد " ہے " یا " ہیں " بڑھا کر بنا لیتے ہیں۔ اردو میں یہ شکل بیسوی صدی تک جاری رہی ہے۔ لیکن اب متروک صرف بعض علاقوں اور طبقوں میں رائج۔ غالبؔ نے اپنی مشہور غزل

ع کھینچتا ہوں جس قدر مجھ سے وہ کھینچتا جائے ہے میں استعمال کیا ہے۔

ع پُھل بھاگ سب پھلے ہیں، دُندے سو دیکھ جلے ہیں (ک م ق ق)

دکنی اردو میں حال مطلق کی کے لیے صرف مضارع کا استعمال بھی ہوا ہے ۔ درحقیقت یہی حالِ مطلق کی قدیم شکل ہے، جو دکنی میں باقی رہ گئی ہے :

ع کرتے مزدوری اپنے بغل میں سو رکھ کتاب (ک م ق ق)

" ہوتا سب خدا کا بھاتا " (س ر)

(مضارع کی موجودہ صورت کا ارتقااس انداز میں ہوا ہے : جاوے ... جاوے ہے ... جائے ہے ... جاوت ہے... جات ہے... جاتا ہے...(جاوے، جاوے ہے، جائے ہے، آئے، بھی کھڑی بولی کے علاقے میں رائج میں رائج ہے ۔ جاوت ہے، جات ہے برج بھاشا کی معیاری اور بول چال دونوں کی شکلیں ہیں ۔ انھیں کی آمیزش سے معیاری اردو کا " جاتا ہے " بنا ہے)

مستقبل :

مستقبل بنانے کے لیے دکنی اردو میں بھی مضارع کے بعد "گا" "گی" (جمع "میں گیاں"، جو معیاری اردو میں نہیں ہے) اور " گے "کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ گیاں (جمع گی)

ترے جب کی اِت سوز دھر آئیں گیاں

سلامت ترے ٹھار انپڑ آئیں گیاں (گ ع)

مستقبل مطلق کی بناوٹ میں (سَ) سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ یہ دکنی اردوکی خصوصیت ہے ۔ اس (سَ) کا تعلق سنسکرت کے زمانۂ مستقبل کے (سَ) سے ہے۔ راجستھانی کی بعض مشرقی بولیوں میں مادّے کے ساتھ (سَ)لگاکر اس طرح کی شکل بناتے ہیں۔ دکنی اردو میں یہ شکلیں تسلسل کے ساتھ نظامیؔ تا نصرتی پائی جاتی ہیں۔

	متکلم	حاضر	غائب
واحد	: مارسوں	مار سے، مارسی	مار سے، مارسی
جمع	: x	مارسوں	مارسی

واحد متکلم مذکر: جاسوں (جاؤں گا) ع کے ہرگز نہ جاسوٗں تیرے کہے منے (ق م)

واحد حاضر مذکر: سے ع جے توٗں کہہ سے رھیا ناکُج (ارشاد نامہ)

جمع متکلم مذکر: سی ع سبھی دوٗراں نہ آسی اجی تج سم (ک م ق ق)

واحد غائب : اس کے دیوے کوں کیوں نہ ہوسی روشنی (س ر)

اس صیغے کے سلسلے میں حسبِ ذیل امور قابلِ غور ہیں۔

(۱) دکنی اردو میں "سی" "سَے" "سوں" اور "سیں" عموماً، نا، یا "نہ" (نفی)) کے ساتھ آتی ہیں۔

(۲) ان علامتوں سے فعلِ مستقبل کے ساتھ "سکنا" فعلِ امدادی کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

ع نہ ہوسی کدھیں پانچ انگل سمان (ک۔ پ)

ع تج سار کہیں جگ میں پریزاد نہ ہو سے (ک غ)

ع سبھی حوراں نہ آسیں آج تج سم (ک م ق ق)

"اس کتاب کوں سینے پرتے ہلاسی نا، اس کتاب بغیر کوئی اپنا وقت بھلا سی نا" (س ر)

"سخی پر کسی کی بددعا چل سی نا" (س ر)

مضارع

دکنی اردو میں مضارع (جو فعلِ حال کی قدیم شکل ہے) حسبِ ذیل بناوٹ کے ملتے ہیں:

چلے (س ر) پاوے (س ر) جائے (پھ ب) پیوے (س ر) سووے (س ر)، دیوے (س ر)

امر

امر کی جمع کی بعض قدیم شکلیں دکنی اردو میں رائج رہی ہیں۔

لیو (پھ ب) دیو (پھ ب) کَو (مصدر کنا = کہنا) امر کی ایک استثنائی شکل ہے۔

منجے اِس ٹھار کیا تدبیر ہے کَو مرا اس ٹھار کیا تقصیر ہے کَو (پھ ب)

فعلِ معطوف

وہ فعل جس کو دوسرے فعل کے ساتھ، کے، کر، کو، یا، کوں، لگاتے ہیں:

کے:، جل کے راک ہونا، (ک غ)

کر/کرکر: "نظر قامت سوں وداع ہوکر، تسلیم کرکر،

سر پر ہاتھ دھرکر اپنے ٹھارتے ہلیا، چلیا" (س ر)

کوں: ع وو حاجب جاکوں بولیاں شہ سوں اپنے (پھ ب)

متعلق فعل

متعلق فعل کی گیارہ قسمیں ہیں۔ یہاں دکنی اردو کے صرف مخصوص متعلق فعل کلمات کا ذکر۔۔ مع مثالوں کے کیا جائے گا

(ا) متعلق فعل کیفیت وحالت

ٹکُ ع جو باتاں میں وہ نارٹک آئے گی (ق م)

(یہ میر تقی میؔر بلکہ اس کے بعد تک رائج رہا ہے)

دھات (= طرح) ع ہوئے جس دھات سوں ووغم تے آزاد (پھ ب) " ہرگز کوئی فصیح اس فصاحت سوں بات نیں کیا، اس دھات بات کوں سلامت نیں دیا " (س ر)

(دکنی اردو کا مخصوص متعلق فعل)

نپٹ ع نپٹ گرچہ خدمت میں ہوبے سمجھ (گ۔ ع)

(میر تقی میؔر کے عہد تک رائج رہا)

جھُٹ مُٹ (= جھوٹ) موٹ

ع خبر چلنے کی سن جھٹ مٹ ہوا ہے تھوڑا تھوڑا جی (وہ)

سچیں مچیں (= سچ مچ) " سچیں مچیں یو فرشتہ ہے " (س ر)

ہلو (= ہولے) ع ہلواس سنگ دل کوں نرم کرتوں (پھ ب)

(" ہلوں " بھی تلفظ کیا گیا ہے)

متعلق فعل زماں

(ا) اب، اِتا، اتال، اتیال، آجنوں

(۲) جب، جداں، جدھاں، جَو

(۳) تب، تدھاں، تَو

(۴) اوّل، پچھے، پچھیں، پیچھیں

(۵) تُرت، بیگی، بیگ

(٦) جَم، ہمیشہ، سدا

(۷) آج، کل، پرسوں

(۸) کدھیں، کد

اتا (=اب) ع اتا میں چپ رہنے کی نئیں مراٹک ہاتھ چھوڑو خوں (وہ)

اتال (=اب) ع اتال تاب نئیں مُنجؔ انتظار کوں جی (ک غ)

جِدھاں (= جب تک) ع جدھاں لگ مہرو چرخِ اختری ہے (پھ ب)

جو (جب (تک) جَو لگ جنوب و مشرق و مغرب ہے ہور شمال (ک غ)

آجنوں: (اب تک)" انو آجنوں ہی جیتیاں ہیں " (س ر)

تدھاں (تب (سے)

ترے ملنے کا مئے پی کر ہوا ہوں مست میں جب تھے

تدھاں تے مئے کی سوگند کھا، تجا ہوں گھر کلا لاں کا (وہ)

پِچھیں (= پیچھے) ع کتک دن کے پچھیں امید کا سور (پھ ب)

تُرت (ترنت، فوراً)

ع ہو عارف تُرت کر لے حاصل اس مطلب ضروری کوں (ک غ)

بیگ (= جلدی) ع وہیں بیگ خالا نے چھاتی لگا (گ ع)

جم (= ہمیشہ) ع جم گڑگڑاوں مست ہو پتی مدن کی ڈھال رے (ک غ)

پرسوں (کل کے بعد کا دن)

ع صبا پرسوں لگوں چنچل تمھارے ہات آتی ہے (وہ)

(موجودہ دکنی بول چال میں پرسوں کے معنیٰ کچھ دن پہلے بھی ہوتے ہیں ۔ ان معنوں میں کلاسیکی دکنی کی کوئی مثال ہمیں نہیں مل سکی۔ شمالی ہند کے لوگ اکثر اس مفہوم سے دھوکا کھا جاتے ہیں)

کدھیں (= کبھی) ع کدھیں بے خبر ہوئے کدھیں ہوئے ہوشیار (ق م)

" انو کا بول کدہیں ہو آتا کدہیں نہیں ہو آتا " (س ر)

متعلق فعل مکان

(۱) یہاں، یاں، وہاں، واں

(۲) جہاں، جاں، کہاں، کاں

(۳) اِدھر، اُودھر، وودھر، کدھر

(۴) اگے، آنگے، انگے، انگیں، آگل، اگل

(۵) بھیتر، بِھتر، بھترال، باہر، بھار

(٦) اوپر، اُپر، اُپرال، آپار

(۷) تلے، تلیں، تلار، تلهار

(۸) نزدیک، نزک، پیلار، ایلار

جاں / واں (=جہاں، وہاں)

" جاں رہے کھڑے واں قبول پڑے (س ر)

وودھر (=اُدھر) ع گھڑی کوں دل گھڑی کوں جیو یو دونوں کھینچے وودھر (ک ع)

اگے (= آگے) (پھ ب)

آنگے (آگے) (ک غ)

آگل (= آگے) ع جس کے آگل کسی کوں منصب نیں (ک پ)

اگل (= آگے) (گ ع)

بھار (= باہر) "اِ سے نہ بھیتر قرار نہ بھار" (س ر)

بِھترال (اندر، بھترال کر زر کا پلو کی چپ کٹاریاں کھاڑتی

(دہ)

اُپرال (=اوپر) ع جو بیٹھا تخت کے اپرال آکر (پھ ب)

تلیں (ک غ)

تلار (= تلے، نیچے) ع رات اندھیاری چھپی جا کے زمیں کے تلار (ک غ)

تلهار (= تلے) گ ع)

نزیک (= نزدیک (دہ)، نزک (ک غ)

پیلاڑ (= پرے) " یو عقل نے پیلاڑ ہے آدمی سمجھتا کیوں" (س ر)

ایلاڑ (= ادھر) " چوڑی ایلاڑ ہے " (س ر)

متعلق فعل استفہام

دکنی اردو حسبِ ذیل الفاظ اس کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

کیوں، کی، کَے، کیا، کاہے، کاہے کوں، کائیکوں، کس دھات، کیوں کر

کی (=کیوں) ع آنگن میں کی کھڑے ہیں جیوں شمع پر پتنگ ہو

(دہ)

کَے (=کیوں) ع مونین میا نے بیس کے بھی کَے نہ آوتے (ک م ق ق)

کائیکوں (=کاہے کوں کا مخفف) ع ہمیشہ کائیکوں اٹتی ہے یوں خاک (پھ ب)

متعلق فعل سبب و علّت

جس دھات، اس دھات، اس بدل، کیا واسطہ کہ، مخصوص دکنی اردو کے ہیں

اس بدل (= اس وجہ سے) " اس بدل کہتے ہیں کہ پیر کی بندگی کرو" (میراں جی خدانما)

کیا واسطے کہ (= اس لیے کہ)" ان دونو ں کوں شہر دیدار کے نزدیک لیا نا کیا واسطے کہ لشکر ہورحشم آتا ہے" (س ر)

متعلق فعل مقدار

ایتا، بتا، جِتا، جیتا، بھوت

یتا (= اتنا) (ق م)

جِتا (= جتنا) (پھ ب)

بَھوت(= بہت) ع تمھارے ملنے کی دل میں کلولی بھوت آتی ہے (وہ) (یہ تلفظ قدیم اردو اور موجودہ بول چال کی زبان میں عام ہے)

متعلق فعل ایجاب و انکار

ہاں ، ہو ، نا

ہو (= ہاں) " ہو تو بی کتا ہے سواس میں ایک مانا ہے " (س ر)

(دکنی اردو میں، ہاں، بھی ملتا ہے لیکن " ہو " اس سے مخصوص ہے جو تا حال دکن میں رائج ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کے ساتھ گردن کی جنبش نفی کے انداز میں کی جاتی ہے جو اکثر شمالی ہند والوں کے لیے غلط فہمی کا باعث بن جاتی ہے)

مرکب متعلق فعل

جب دوکلمے ایک ساتھ کسی فعل کی وضاحت کے لیے لائے جائیں۔ دکنی اردو کے خاص مرکب متعلق فعل حسبِ ذیل ہیں

(۱) کیئں کا کیئں، کاں کاں، آس پا سے۔

(۲) جاں، لگوں، اجھوں لگ، جَو لگ، تَو لگ، جدھاں لگ، تدھاں لگ

(۳) جُلگ، تُلگ، ، جَو لگن، تو لگن، کَو تلک، تَو تلک

آس پا سے (= آس پاس) ع کہ جیوں چاند کے آس پا سے نجوم (گ ع)

جاں لگوں (= جہاں تک) ع ساتی گئے ہیں جاں لگوں وہاں لگ تو جانا ہوئیگا

(دہ) جُلگ / تُلگ (= جب تک / تب تک)

جلگ دور عالم کا باقی اچھے

تلگ یاد یو بزمِ ساقی اچھے (گ ع)

جَولگن / توَلگن (=جب تک / تب تک)

" جَولگن دینا تولگن ا سے حیات (س ر)

کو تلک (= کب تک) ع اچھوں میں کَو تلک روتی بلکتی (پھ ب)

الفاظ کی تکرار

دکنی اردو میں اس سلسلے میں اکثر ایک درمیانی " ے "کا اضافہ ہوجاتا ہے ۔ رگے رگ (= رگ رگ) (پنج گنج : جانم) ، گھرے گھر (ک غ) جنگے جنگل (ک غ) بَنے بَن(ک غ) ، راتے رات (پھ ب) ہاتے ہات (گ ع) تکرار لے لیے اکثر " ں "کا بھی درمیان میں اضافہ کردیا جاتا ہے۔

ٹھاریں ٹھار (س ر) ، بالیں بال " آدمی کو پریشانگی ہے ۔ بالیں بال " (س ر)۔

ٹھاویں ٹھاوں (س ر)

کبھی کبھی تکرار کے لیے دو لفظوں کے درمیان " الف " بھی لایا جاتا ہے ۔

ع رنگا رنگے پھولاں کی ہے ہر چمن کو آ ج فَرحْ(ک غ)

حرف

حرفِ ربط

علامتِ اضافت : دکنی اردو میں کا ۔ کی ۔ کے علاوہ کیرا ، کیری اور کیرے بھی بطور علامت اضافت رہے ہیں ۔ ان کا استعمال مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اور نو سرہر جیسی قدیم تصانیف میں ملتا ہے ۔ لیکن وجہیؔ نے سب رس میں کا۔ کی ۔ ۔ کے۔ ہی استعمال کئے ہیں۔ اس کا گا ہے گا ہے استعمال نصرتیؔ کے زمانے تک رہا ہے۔

ع مچھندر کیرا پوت آکھور ناتھ (ک۔ پ۔ شعر ۳۶۶)

ع آنکھیں کیرا کا جل پونچھ (ن۔ ہ۔ شعر ۱۱۴۱)

ع کہ کجلی بن اُس بن کیرانا نؤ ہے (گ غ۔ ص ۱۴۲)

کیرے (گ ع) ، کرا (= کیرا) (پھ ب)

ان حروف کے استعمال کا قاعدہ یہ ہے کہ جب مضاف واحد ہوتا ہے تو "کا " یا کیرا لا تے ہیں ۔ جمع مذکر میں " کے " یا "کیرے " اور واحد مونث یا جمع مونث میں " کیری " لا تے ہیں ، مضاف اگر جمع مونث ہو تو

حرف اضافت "کی" کی جمع "کیاں" بنائی جاتی ہے

کیاں (=کی جمع مونث) ع پیاریاں شاہ کیاں مل عید کا سنگار کیتاں ہیں (ک م ق ق)

علامت فاعل

علامت فاعل " نے " ہے ۔ لیکن یہ علامت ہر زمانے اور فاعل کے ساتھ استعمال نہیں ہوتی ۔ اس کے استعمال کے چند قاعدے ہیں ۔ عام طعر پر یہ ماضی مطلق ، ماضی بعید و قریب اور فعل لازم و متعدی کے ساتھ استعمال کی گئی ہے۔ سب رس میں ماضی استمراری کے ساتھ یہ علامت کبھی نہیں آتی۔

حرف نے "کا" استعمال کدم راؤ پدم راؤ میں مطلق نہیں ملتا۔

(۱) ماضی مطلق کے ساتھ " نے "کا استعمال

" وہی بولیا جو خدا نے فرمایا " (س ر)

(۲) ماضی قریب کے ساتھ ، نے ،کا استعمال

" خدا کے دوستاں نے بولے ہیں " (س ر)

(۳) ماضی بعید کے ساتھ ؛ نے استعماال

" ہمت نے مکتوب لکھا تھا " (س ر)

(۴) دکنی اردو میں ، نے ، فعلِ متعدی اور فعلِ لازم دونوں کے ساتھ استعمال ہوتی ہے

فعلِ متعدی : ع کیا صبح نے جھَل سوں دامن کوں چاک (گ ع)

فعلِ لازم : " رقیب نے روسیاہ نے بے نصیب نے بولیا " (س ر)

(۵) دکنی اردو میں ، نے ،کا استعمال فعل جنس اور تعداد میں فاعل کے تابع ہوتا ہے۔

بلحاظ جنس : زہرہ نے جلوہ گائی (س ر)

خضر نے بی انکھیاں سوں وو نچ اشارات دکھلایا (س ر)

بلحاظ تعداد نازاں نے گھونگٹ کھولے (س ر)

دکنی اردو میں ماضی مطلق ، ماضی قریب اور ماضی بعید کے ساتھ ' نے 'کا استعمال ضروری نہیں ہے یہ اکثر حذف بھی کردیا جاتا ہے ۔

ماضی مطلق : ع راجنا کل جو خواب دیکھی میں (ک غ)

ماضی قریب : ع سکھی توں کجلٹا پن سب سٹی ہے (ک ب)

ماضی بعید : ع وو ایسے وقت شہ مجلس کیا تھا (پھ ب)

علامتِ مفعول

دکنی اردو میں علاماتِ مفعول یہ ہیں : کو ، کوں ، تیئں ۔

(۱) مفعول ذی عقل یا جاندار ہو تو ، کون ، یا ' تیئں ، علامت مفعول استعمال ہوتی ہے۔

' دل کوں صاف کرو ، بہت نکو لاف کرو ' (س ر)

ع خدا تئیں جا کہہ توں تو بھی کہ اس عالم کی جیوتی کوں (ک غ)

(تیئں کا استعمال شمالی ہند میں انیسویں صدی تک رہا ہے اب دہلی اور اس کے اطراف میں صرف بول چال میں رہ گیا ہے۔ تحریر میں متردک ہے)

(۲) اردو میں مفعول ذی عقل یا بے جان ہو ، تو علامت مفعول استعمال نہیں ہوتی لیکن دکنی اردو میں ایسی صورت میں بھی اکثر باریہ علامت مفعول کے طور پر لائی جاتی ہے۔

سناراں اس انگشتری کو ایسے وقت میں گھڑے (س ر)

ع وہاں تے آیتہ الکرسی کوں پڑکر (پھ ب)

ع چھپی سوبات کوں اس سوں اٹھی بول (پھ ب)

(۳) بعض اوقات علامتِ مفعول محذوف بھی ہوتی ہے

ع خدا اَپ صنع تے دیتا ہے تم ناز (ک م ق ق)

(۴) دکنی اردو میں ' نے ' بھی علامتِ مفعول کے طور پر استعمال ہوتی ہے جیسے :

' نفر ہزار ہزار ہو تو بی صاحب نے اپنا داب رکھتا ' (س ر)

(یہ خصوصیت ہریانوی میں آج بھی عام ہے۔ جیسے : من نے صاحب نے ماریا ' = مجھ کو صاحب نے مارا)

حروفِ جار

(۱) میں ، منَے ، منیں ، بِھتر

(۲) سے ، سوں ، سو ، سِتی ، سیتی ، سیتیں ، سینتھیں ، تھیں ، تِیں ، ستے ، سیتھے ، تھے ، تے ۔

(۳) تلگ ، لگ ، لگوں ، لگن

(۴) پر ، اُپر ، اوپر ، اُپرال ، پو ، پہ

(۵) کدن ، کدھن ، سنگات ،

(٦) تائیں ، کنے

منے : ع توں جامع فضائل منے سب ہوا (گ ع)

منیں : ع پکڑ غصّے سنی دانتاں منیں لب (پھ ب)

بِھتر : (ک۔ م۔ ق۔ ق)، سوں : (س ر)

سِتی : ع الہیٰ غیب کے پردے ستی توں (پھ ب)

سیتی : ع گلِ مصطفٰے سیتی سیرا گندھا کر (ک م ق ق)

تھیں : ع ہمارا درد تمن دوری تھیں ہے گاڑا سخت (ک م ق ق)

تیں : ع زمیں تیں نیشکر جب بھار آیا (پھ ب)

ستیھے : ع ہوا پر گٹ جدھاں ستیھے دینا ہوردین قدرت سوں (ک م ق ق)

تھے : (ک۔ م۔ ق۔ ق)، تے (س ر)

لگ : (= تک) (س ر)

تلگ : (ک۔ م۔ ق۔ ق)، لگ (گ ع)، لگوں (د ہ) لگن (س ر)

اُپرال (= اوپر) ع جو ب ٹھا تخت کے اُپرال آکر (پھ ب)

پو (= پہ) " موں پو مسجد دل میں بت خانہ " (س ر)

کدن (= طرف) (د۔ ہ) کدھن (پھ ب) (س ر)

نزک (= نزدیک) (گ ع) تائیں (= واسطے)

تیرے تائیں ہوئی ہے یو بدنام یاں (و م)

سنگات (س ر)

حروفِ عطف

(۱) اور، ہور، د، کیا

ہور (اور) ع تو نچہ ان کا ماہور باپ (ن ہ، شعر ۲۳۵)

ع دین ہور دینا اُنن اسلام تھے پایا رواج (ک م ق ق)

" خیال ہور نظر " (س ر)

و (اَور : واؤ عطف فارسی)

دکنی اردو میں یہ دو ہندی الفاظ اور ایک ہندی ایک فارسی کے درمیان بھی آتا ہے۔

"خدا میں و اس کی قدرت میں" (ک ح ص ۲۶) " مرنا و جیونا " (ک ح)

گن و گیان (ک م ق ق)

(یہ رجحان دہلی کے متقدمین شعرائے اردو تک میں رہا ہے)

کیا: "کیا عورت کیا مرد جس میں ہے کچھ عشق کا درد" (ر)

حروفِ استدراک

ولے، پَن، امّا، مگر، گرچہ، بلکہ، پَن (= پر) "بات جدا پَن بھید وہیچ (س ر)

(دیگر جدید اردو سے اشتراک رکھتے ہیں)

حروف استثناء

بِن، بِنا، باج، بغیر، بغر، بجز

بِنا (= بِن، بغیر) ع قلیہ برنجی خاگینہ کیوں کھاؤں میں ساتی بِنا (دہ)

باج (= بغیر) ع پیاباج پیالہ پیا جائے نہ (ک م ق ق)

حروفِ تخصیص

ہر، بھی، بی، تو، ہی، ۔ "چ"

ہر ایکس (ہر ایک) "ہر ایکس پاس کون منگ لیتا (س ر)

(ہر کے ساتھ ایکس کا استعمال صرف اشخاص کے لیے مخصوص ہے۔ بے جان اشیاء کے استعمال نہیں ہوتا)

تو: ع تو نا کہے تو کون کہے عندلیب (ک غ)

چ: (تاکیدی یا تخصیصی)

" نکو "کی مانند دکنی اردو کے لیے کلیدی حرف کا حکم رکھتی ہے ۔ یہ علامت مراٹھی سے مستعار لی گئی ہے ۔ گجراتی میں یہ " ج "کی شکل میں آتی ہے ۔ شمالی ہند کی اردو میں یہ معدوم ہے بجز اسمٰعیل امروہوی کے ۔ اس سلسے میں یہ بتادینا ضروری ہے کہ اسمٰعیل نے عالمگیر کے لشکری کی حیثیت سے اپنی زندگی کے بیس پچس سال نواحِ اورنگ آباد میں گزارے تھے ۔ تاھم " چ " تخصیصی کا استعمال اسمٰعیل نے بھی شاذ کیا ہے ۔

وہی آب ابریق موں تھا تمام

کہ تھا آب کوثر اسی کا چ نام

ورنہ قدیم وجدید دکنی اردو میں یہ تخصیصی حرف اسم، فعل اور حرف ہر ایک کے ساتھ مرکب آتا ہے اور کثرت سے استعمال ہوتا آیا ہے نظامیؔ نے بھی اپنی مثنوی کے دو شعروں میں استعمال کیا ہے ۔

ع نہ بھاوے مجھے وہ جو میرا چ باپ (ک۔ پ۔ شعر ۲۲۸)

ع اِکا یک کہیا تو نچ میرا چ سیکھ (ک۔ پ۔ شعر ۵۵۴)

مزید مثالیں

ع تو نچ ان کا ماہور باپ (ن۔ ہ، شعر ۲۳)

" وے حیران ہوئیں گے کہہ نا سکیں گے کہ یو نچ ہے یا ایسا چ ہے " (س ر)

ع جدھر دیکھوں تو فریاد آج سب تیرا چ ہوتا ہے (گ ع)

ع سو ویسا چ تس پر پڑے آسبب (گ ع)

(سنسکرت میں اسکا مآخذ " چَ ایو " ہے)

حروفِ تشبیہ و مثال

ناد، سار، نمن، نمنے، مانند، جانو

ناد : ع فلک کے ناد کس جا گے پہ نا ٹھار (پھ ب)

نمن : ع کیا دکھ سو دندیاں نمن جگ تے بہار (گ ع)

نمنے : ع رگے رگ وہ خوش روح نمنے سرس (گ ع)

"کر" کا مخصوص استعمال

دکنی اردو میں، کہہ کر، کا مخفف، ککر، استعمال کرتے تھے۔ یہ علامتِ معطوف کے علاوہ (جیسے، پھاڑکر) ککو (کہہ کر = ککر) کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

ع نکو جانو جھاڑاں کوہیں جھاڑ کر (ق م)

ع ساقی ہمارے گئے وہاں جو ملک ہے ملبار کر (دہ)

یعنی "ککر" = کہہ کر

اسی طرح موجودہ دکنی کا ایک عام کلمہ، بول کر، ہے جو کہہ کر (= ککر) ہی کے معنوں میں مستعمل ہے۔

" شراب تو خوب ہے ولے ستمی اُ سے بُرا بول کر ڈراتے " (س ر)

نحوی خصوصیات

دکنی اردو کی نحوی خصوصیات جاننے کے لیے ہمارے پاس نثر کے کافی نمونے نہیں ہیں۔ چوں کہ دوسری زبانوں کے مانند دکنی اردو کا قدیم ادب منظوم ہے اس لئے جملوں کی بناوٹ کا صحیح علم حاصل نہیں ہوتا۔ پھر قدیم نثر پر عربی فارسی کی نحوی ساخت کی خاصی چھاپ رہی ہے ۔ نثر کے قدیم رسالوں میں سے اکثر فارسی عربی سے ترجمہ ہیں یا تلخیص ہیں اس لیے ان کے مصنفین کا اصل عبارت سے متاثر ہوجانا ضروری ہے۔ دکنی اردو نثر کا سب سے اعلیٰ اور جامع نمونہ ہمیں وجہیؔ کی سب رس میں ملتا ہے لیکن مرصّع و مقفّٰی نثر ہونے کی وجہ سے اس میں دکنی کی نحوی ساخت چھپ جاتی ہے۔ عربی فارسی نحو کے اثرات اس قسم کے جملوں سے ظاہر ہیں۔

(۱) ایسا اس تن میں جاں تو سب چیزاں پر دوکھ سوکھ، مرنا و جیونا (ک ح ۳۴)

(۲) سوال، اوکہاں تھا کہیں تو تعلقات جاگا سوں دھرتا تھا بھی؟ (ک ح، ۲۲)

(۳) خدا کہا نماز کے نزدیک نکو ہو مستی کے حال میں (معراج العاشقین)

(۴) انوں بی نماز کرتے اپنے اپے (معراج العاشقین)

اس دور میں جملے کے نصف اوّل میں صفت کی صورت میں جملے کے جزکو استعمال کرنے کا میلان بھی نظر آتا ہے۔

"جسے کپڑے سو اس کی آستین میں پیکے تھے" (شکار نامہ)

"ہور درود اپنے رسول پر بھیجنا اور ان کے فرزندوں پر ہور سب امت کے خاصاں پر" (شرح مرغوب القلوب)

سولھویں صدی عیسوی سے دکنی نثر کے جملے کی بناوٹ زیادہ باقاعدہ ہونے لگی۔ آج کل کی اردو کے مطابق اس میں بھی

(۱) جملے میں فاعل پہلے، پھر مفعول اور آخر میں فعل آتا ہے۔

(۲) فعلِ ناقص مبتدا اور جز کے بعد آتا ہے۔

(۳) صفت موصوف سے پہلے آتی ہے۔

(۴) متعلق فعل عام طعر پر فعل کے پہلے آتا ہے۔

(۵) حروف فجائیہ جملے کی ابتدا میں آتے ہیں۔

(۶) حروفِ تخصیص کلمے کے ساتھ آتے ہیں۔

البتہ ، مطابقت ، میں دکنی اردو اور جدید اردو میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔

(۱) موجودہ اردو میں فعل متعدی اپنے مفعول کے تابع ہوتا ہے۔

" میں نے روٹی کھائی " " ہم نے روٹی کھائی " " ہم نے روٹیاں کھائیں " " اس نے روٹیاں کھائیں "

(۲) دکنی اردو میں فعل متعدی اپنے فاعل کے تابع ہوتا ہے۔

ماضی مطلق فعل متعدی کھانا

	واحد مذکر	واحدمونث	جمع مذکر	جمع مونث
متکلم	میں روٹی کھایا	میں روٹی کھائی	ہم روٹی کھائے	ہم روٹی کھائے ، کھائی کھائیں ، کھائیاں۔
حاضر	تو کھانا کھایا	تو کھانا کھائی	تم کھانا کھائے	تم کھانا کھائے
غائب	وہ آم کھایا	وہ روٹیاں کھایا	وہ روٹیاں کھائے	وہ روٹیاں کھائے ، کھائیں ، کھائیاں

(۳) ضمیر اپنے مرجع کے تابع ہوتی ہے۔

(۴) جمع مونث کا اثر امدادی فعل تک پہنچتا ہے۔

"جو کچھ باتاں بولنے کیاں تھیاں " (س ر)

(۵) صفت اپنے موصوف کے تابع ہوتی ہے

ع کچیاں کو نْلیاں کُنوٗانْریاں ناریاں کلیاں کو نوروز آیا (م۔ ق۔ ق۔ ص ۱۳۰)

(٦) اردو میں علامتِ اضافت جنس میں اپنے مضاف کے مطابق آتی ہے لیکن دکنی اردو میں جنس میں مطابقت کے علاوہ جمع مونث کی صورت میں علامتِ اضافت کی بھی جمع بنالی جاتی ہے ۔ جیسے : " انوکیاں انکھیاں " ،

" محبت کیاں چار باتاں " " جیوں کیاں پیاریاں " " ناز کیاں باتاں " (س ر)

(۷) جمع موصوف کے ساتھ صفت اشاری واحد استعمال ہوتی ہے ، جیسے : " اس لوکاں کا کیا جاتا "

" اس باتاں سوں ہمنا کیا کام " اس مستیاں کوں کیا کنا " (س۔ ر)

(تشریح : جمع مونث کا اثر صفت اور فعل پر شمالی ہند کی قدیم اردو میں بھی پایا جاتا ہے لیکن علامت اضافت کی جمع کی کوئی مثال شمال کی اردو میں نہیں ملتی ۔ یہ غالباً دکنی اردو میں بھی بہت جلد متردک ہوگئی تھی۔ سب رس تک میں وجہیؔ نے بعض اوقات اس سے انحراف کیا ہے : مثلاً

" نظر کی انکھیاں باندیا " (بجائے نظر کیاں انکھیاں باندییا)

اردو کے عہد بعہد کے نحوی ارتقا کی تشکیل حسب ذیل جملے میں تبدیلیوں کے ساتھ دکھائی جاسکتی ہے:

(۱) جواہرات کیاں رنگ برنگیاں کوٹھریاں بھریاں تھیاں (دکنی اردو)

(۲) جواہرات کی رنگ برنگیاں کوٹھریاں بھریاں تھیاں (سترھویں صدی کی اردو)

(۳) جواہرات کی رنگ برنگی کوٹھریاں بھریاں تھیں (اٹھارویں صدی کی اردو)

(۴) جواہرات کی رنگ برنگی کوٹھریاں بھریں تھیں (انیسویں صدی کی اردو)

(۵) جواہرات کی رنگ برنگی کوٹھریاں بھری تھیں (جدید اردو)

شمالی ہند میں اُردو (۱۷۰۰ یا ۱۸۵۷ء)

شمالی ہند میں ۱۷۰۰ء تک 'ریختہ' کی شکل میں کھڑی بولی کا ادبی ارتقا ہوچکا تھا لیکن برج بھاشا کی ادبی حیثیت ابھی تک مسلّم تھی۔ شاہ جہاں کی آگرے سے دہلی واپسی (۱٦۵۸ء) کے بعد ممکن ہے زبانِ دہلی کو اور مہمیز ملتی اگر اورنگ زیب ۱۷۸۲ء کے قریب دکن جاکر وہیں کا نہ ہو رہتا۔ درحقیقت شاہ جہاں آباد ابھی مکمل طور پر ادبی ولسانی مرکز بننے بھی نہیں پایا تھا کہ اورنگ آباد آباد ہوگیا۔ ۱٦۸٦ء اور ۱٦۸۷ میں اورنگ زیب کی فتح بیجاپور اور گولکنڈہ کے بعد شمال دکن کے تہذیبی باب پھر کھل گئے۔ اس زمانے میں شعراء ادباء اور اہلِ علم کی جس قدر آمدورفت دہلی اور دکن کے درمیان رہی ہے اس کی نظیر کسی اور زمانے میں نہیں ملتی۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب حکمرانی کی ایک طویل مدت ختم کرنے کے بعد راہی ملک عدم ہوتا ہے۔ بادشاہت پھر لال قلعہ اور دہلی کو لوٹ آتی ہے۔ اس وقت، زبانِ دہلیِ تخلیق کے لیے تیار تھی۔ لوگ فارسی سے اوب چکے تھے۔ اسی زمانے میں (۱۷۲۰ء) ولّی کا دیوان دہلی پہنچا تو وہاں کے کوچہ و بازار میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ جوشِ تتبع میں دہلی کے شعرا نے نہ صرف ولّی کے اسلوب شعر کی پیروی کی بلکہ اکثر ولّی کی زبان کے ایسے متروک الفاظ تک استعمال کرگئے جو "بموافق محاورۂ شاہ جہاں آباد" نہ تھے۔ مثلاً کم از کم ایک شاعر نے دکنی اردو کے کلیدی لفظ نکو (حرف تخصیص) کو اپنی غزلوں میں جگہ دی جس سے زبانِ دہلی بالکل ناآشنا تھی، اس لیے کہ دکنی میں یہ مراٹھی سے مستعار آیا ہے۔

کیوں صحبتِ بداں میں نکو روئے بیٹھ کر
بولے ہے طَور غم ستی یکرو کا جی گھٹا

مجھ کوں واعظ نکو نصیحت کر یار جس سے ملے بتادوفن (یکرو)

شمالی ہند کے پہلے صاحب دیوان شاعر جمیل جالبی کے مطابق شاہ مبارک آبرو (۱۷۳۳ ۔ ۱۲۸۴ء) ہیں نہ کہ نواب صدرالدین فائز۔ وہ اٹھارویں صدی کے آغاز کی زبانِ دہلوی کے پہلے نمائندے ہیں۔ اس سے قبل

جن شعرا کی زبان سے ہم نے بحث کی ہے (محمد افضل افضلؔ اور روشن علی) ان کا تعلق نواحِ دہلی سے تھا ۔ ایک کانارنول (ہریانہ) اور دوسرے کا ، سہارن پور' سے ۔ اسی لیے ان کی زبان غیر متعین اور غیر معیاری ہے ۔ لیکن آبروؔ کی زبان کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا اس لیے کہ وہ دہلوی ثم دہلوی ہیں ۔ ہر چند یہ زبان شاعری کی زبان ہے جو بول چال کی زبان سے کافی مختلف ہوتی ہے لیکن تمام زبانوں کے عہد بعہد ارتقاکی داستان کی بنیاد بہر حال ان کا تحریری ادب ہی ہوتا ہے ۔ جمیل جالبی کا یہ خیال کہ " آبروؔ کی زبان اور دکنی اردو میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں " صحیح نہیں ۔ اگر دکنی اردو سے ان کی مراد ولی کی زبان ہے تو ان کا یہ بیان کسی حد تک صحیح ہے لیکن اگر اس سے مراد محمد قلی قطب شاہ اور نصرتی کی زبان ہے تو دونوں کے محاورے اور قواعد میں اسی قدر فرق ہے جس قدر کسی زبان کے ارتقا کے تین سو سال میں ہونا چاہئیے ۔ اورنگ آبادی اردو (خصوصاً ولیؔ اور سراجؔ کی زبان)تو درحقیقت عالم گیر کے عہد کی " شاہ جہاں آبادی " ہی کی ایک شکل ہے جس میں وجہیؔ اور نصرتیؔ کی زبان کی صرف باقیات مل جاتی ہیں ۔ اٹھارویں صدی کے نصف اوّل کی زبان (جس کے آبروؔ پہلے نمائندے ہیں) اس صدی کے نصف دوم کی زبان دہلی اور دکنی اردو کے اورنگ آبادی روپ کے درمیان کی کڑی کہی جاسکتی ہے ۔ حسب ذیل اسکی لسانی خصوصیات ہیں۔

صوتیاتی خصوصیات

(۱) تخفیفِ مصوتّہ اس کی بھی خصوصیت ہے لیکن اس حد تک نہیں جس حد تک ہم دکنی اردو میں مطالعہ کرتے ہیں ۔ اسی نسبت سے اس میں مشدّد الفاظ بھی اس کثرت سے نہیں ملتے جس قدر محمد قلی قطب شاہ وجہی ، نصرتی یا شمال میں روش علی کی زبان میں پائے جاتے ہیں ۔ ڈیڑھ سو سال تک (۱۵۰۴ تا ۱۶۴۸) آگرہ دارلسلطنت رہنے کی وجہ سے اردو میں تخفیفِ مصوّتہ اور نتیجتاً مشدّد الفاظ کے استعمال میں کمی آجاتی ہے ۔ نوادر الالفاظ (۱۷۵۱ء) میں خانِ آرزو کا جو ردِّعمل ہریانوی عبدالواسع ہانسوی کے تلفظ کے خلاف ملتا ہے وہ اسی کی نشان دہی کرتا ہے ۔ تاہم تخفیفِ مصوّتہ کی خاصی مثالیں اس عہد کے شعراء و مصنفین کے یہاں مل جاتی ہیں :

(۱)چندنی(چاندنی،دف)،جگّ (ق م د)(اس عہد کے دیگر تمام مصنفین کے یہاں "جاگہ " ہے) ،چدّریں (ق م د)، گل (=گال ، دف) سُرج (= سورج ، دف)، چُٹ (=چوٹ، ک م)توں توں (= یتوں یتوں ، ک م)

(۲) اس کے برعکس مختصر مصوتوں کو طویل مصوتوں میں بدل دینے کا رجحان بھی جارہی رہا ہے ۔

جاگہ (د آ، ک م) ، پھیر (=پھر، ک ز ، د آ ، ا ح ، دن ، ک م) ، ناہیں (دف) ، باتی (ک ز) پاتی (دف ، ق م د) لوہو

(د آ،ا ح، ک م) راکھنا (دف، ا ح) ، ہانسی (= ہنسی ، ق م د) پات (دف ، ق م د)، پھاندا (د ف) پھاٹنا (دن)لاگا (دف ، دن ، ک م) ،مائی (یہ لفظ دکنی اردو سے لے کر اٹھارویں صدی کے تمام مصنفین کے یہاں اسی تلفظ کے ساتھ ملتا ہے۔ اسکا، مٹّی ، تلفظ بہت بعد کا ہے۔) آنکھیاں (د ح)

ع سبزی یہ پشتِ لب کی تری آنکھیاں سوں دیکھ (دیوان قدیم : حاتم) دیوان زادہ (۱۷۵۵ء) میں حاتمؔ نے یہ مصرع بدل کر یوں کردیا ہے۔

ع سبزے میں پشتِ لب کے ترے عکسِ رنگ پاں

(۳) مصّوتوں کو انفیا نے کا رجحان اب تک بہت عام تھا :

لچھمیں (= لچھمی، ک ز)، ملاّں (د آ)، کرناں (د آ) کوں (ک ز، د آ ، دن ، ا ح) ، نیں (= نے ، دا ، ق م د، ن ط م) سیں (= سے ، د آ ، ا ح ، دف ، دن ، ق م د) توں (= تو دا ، ا ح ، ن ط م تقریباً سب مصنفین کے یہاں) سانون (=ساون دن ، ق م د) ، آگیں (ا ح) ، تیں (دف ، ق م د)، پریں (= پری ، ق م د) ، مرناں (دا) ، پہلیں (ا ح، ق م د)، کونچ (ک ک) پینسے (= پیسے ، ک ک) نانک (ق م د) ناچ (ق م د) ہوناں (ق م د) ، تیریں (ق م د) میریں (ق م د ،) ، سپناں (ق م د) جاماں (ا ح) ۔ اعداد میں بھی یہ انفیت ملتی ہے ۔ کربل کتھا میں یہ اعداد آئے ہیں : گیارنہ (گیاراں) ، بارنہ (باراں) ، تیرنہ (تیراں) چودنہ (چودان)، سترنہ (ستراں) ،اٹھارنہ (اٹھاراں)جو آج بھی اہل دہلی کے تلفظ کی خصوصیت ہے۔ ان میں غنّہ ہائے مختفی = (ہ اں)

(۴) اس کے برعکس غنّہ کو حذف کردینے کی مثالیں بھی اس عہد میں مل جاتی ہیں ۔ یہ خصوصیت دکنی اردو میں بھی پائی جاتی ہے۔

نید (=نینْد، ک ک ، ق م د) قیچی (= قینچی ، ق م د) مگانا (ق م د) ،کو آ(ق م د) ، لیڈی (=لنْیڈی ، ق م د) آ(ق م د)، ما (= ماں ، ق م د اور دیگر مصنفین کے یہاں بھی ۔ باغ و بہار میں"ماباپ " ہے)مہدی(مینْہدی، ق م د) مُدنا (= منْدنا ، ق م د)

(۵) ساکن کو متحرک بنا دینا ، یہ رجحان روشن علی جیسے قصباتی شاعروں کی حد تک نہیں لیکن "فصحائے دہلی بھی " عوامی تلفظ کے دباؤ پر اس سے نہیں بچ سکے ہیں۔

نَبضَ (ا ح) ، نَذَر ع دل کو نَذَر کرو تب اوس اوپر نظر کرو (ا ح)

گَرمَ (ا ح ۔) نَین، رَینَ ، حُسَن د ف)

(٦) متحرک کو ساکن بنانے کی خصوصیت پنجاب میں عام ہے اس کی چھوٹ کبھی کبھی " مرزایانِ دہلی " تک پہنچ جاتی ہے۔

مَرْض ع اب تک یہ مَرْض عشق کا پایا نہیں ہنوز (ا ح)

پَلکؕ، ہِرْن ، کِرْن (دف)

(۷) درمیانی (ہ) اور نفّسی (ھ) کو حذف کردینا دکنی اردو کی عام خصوصیت رہی ہے ، دہلی اور اس کے نواح کی بولیوں میں بھی تلفظ کا یہ عمل شدّت سے ملتا ہے، جو بول چال کی اردو میں آج بھی موجود ہے ۔ قدمائے دہلی ا سے شعر میں بھی باندھ دیتے تھے ۔

نیئں (= نہیں۔ حاتم ، ناجی بلکہ تمام شعرائے متقدمین اور فضلی اور عیسوی خاں کے یہاں یہ تلفظ موجود ہے) راک (=راکھ ، دف) کاچن (=کاچھن ، دف) ، پنکڑی (= پنکھڑی ، دف) تُج ، مُج ، سانجْ (ک ک)

(۸) اس کا الٹا رجحان یعنی ہائے مخلوط (ھ) کا اضافہ بھی کردیا جاتا ہے ، جیسا کہ ہم دکنی اردو میں دیکھتے آئے ہیں۔ یہ پنجابی، ہریانوی اور برج بولیوں کی بھی خصوصیت ہے ۔

گھیو (=گیہوں ، ک ز) ، بگھولے (= بگولے ، دا) تڑپھنا (تڑپنا دا ، ا ح ، ک م) چیلھ (= چیل ، نوادر) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پرگھنا(= پرگنہ ، دف)، جھوٹھ جھوٹھا (ک ک) ہونھ (= ہوں ، ق م د) کلّھ (کل د ف ، ک ک ، ق م س) بھا بھی(نوادر) ، دھوکھا (نوادر) ، ہوٹھ (ک م) بھیکھ (ک م) مچھلکا (ک م) ،بھل (بل ک م)،

(۹) دکنی اردو میں " ق "کا تلفظ " خ" کیا جاتا ہے ۔ یہ خصوصیت شمالی ہند کی قدیم وجدید زبان میں گاہ گاہ مل جاتی ہے:

مذا خ (= مذاق، دا ، ق م د ، ب ب)

ع عاشق ستاونے کو سمجھتا ہے کیا مذا خ (آبرو)

دہلی اور اس کے نواح میں عوام آج بھی وَخت (وقت) ، صندوخ (صندوق) ، بندوخ (بندوق) اور اتفّاخ(اتفاّق) بولتے ہیں۔

(۱۰) ، عربیت، کے زیر اثر کبھی کبھی ، ک ،کا تلفظ ، ق، بھی کرلیا جاتا ہے : گاھق (=گاہک) ع گاھق جو اس بازار میں کے ہیں (آبرو)

(دہلی کی کرخنداری اور عوامی بولی میں کبوتر کو " قبوتر "کہہ لیتے ہیں)

(۱۱) (ڑ) پر (ڈ) کو ترجیح ۔ برج بھاشا کے زیر اثر اردو کا صوتی سفر (ڈ) سے (ڑاور ر) کی جانب ہوا ہے ۔ جیسے ٹھڈّی سے ٹھوڑی ، گڈّی سے گاڑی ، گڈّھا سے گڑھا ، پھلواڑی سے پھلواری ، کڑوڑ سے کرور لیکن قدیم اردو میں(ڈ) کی نمایاں حیثیت قائم تھی :

کاڈھ (کاڑھ)(دا) بڈھاوٴنا (= بڑھانا ، نوادر)

بڈھئی (بڑھئی ، ک ک) ، بڈھیا (= بڑھیا ، ک ،) بوڈھا

(= بوڑھا ، ک ک) ، بڈھاؤن(=بڑھاؤں ، ک ک) بڈبھس

(= بڑبُھس۔۔۔ نوادر) پاڈہ (= پاڑہ ۔ ۔ ۔۔ نوادر)، ڈیوڈھی

(= ڈیوڑھی۔۔۔ نوادر) ماڈھی (= ماڑھی۔۔۔ نوادر)،'ڑ' کا 'ر' میں تبدیل ہوجانا

جھَری (= جھڑی) لال بادل کی تجھ جھری ہے یاد (فائز) (قافیہ پری، سرسری وغیرہ)

صَرفی خصُوصیات

جِنس

تذکیر و تانیث کے نقطۂ نظر سے اس عہد کی اردو موجودہ اردو سے حسبِ ذیل الفاظ میں مختلف ہے:

مذکر: بہار (دف، جان (دا، ا ح، ک ک، ک م)

(یہ لفظ دکنی اردو سے مسلسل مذکر استعمال کیا گیا ہے ۔ دکنی اردو میں اس کا مترادف، روح، بھی کلمتہ الحقائق میں مذکر استعمال ہوا ہے)

سوگند (ک ک) غرض (ک ک)، اصل (ک ک)، آیت (ک ک)، راہ (ک ک)، وحی (ک ک)، پرواز (ک ک)، کمر (ک ک)، سیر (ک م) شام (ک م)،

تعداد

اردو میں مختلف حالتوں میں جمع کے لیے مختلف علامتیں لگائی جاتی ہیں لیکن ان میں سب سے اہم تبدیلیاں وہ ہیں جو جمع کی حالت میں حرفِ ربط آنے سے پیدا ہوتی ہیں ۔

مذکر اسماء میں جمع کے لیے آخر میں (۔ ون) بڑھا دیا جاتا ہے ۔ جمع کی یہ شکل اٹھارویں صدی میں ابتداء سے زبان میں رائج نظر آتی ہے ۔ یہ کھڑی بولی کی معیاری شکل ہے جس کا بھرپور استعمال ہمیں روشن علی کے عاشور نامہ میں ملتا ہے جو ۱۶۸۸ ء کی تصنیف ہے ۔ اس دور کے شعرا و مصنفین نے ہریانوی (۔اں) کی علامتِ جمع کے ساتھ ساتھ اس کا بکثرت استعمال کیا ہے ۔ یہ ایسے الفاظ ہیں جن کے آخر میں (ا) یا (ہ) ہوتی ہے، حرفِ ربط آنے سے جمع میں اِن کا الف یا (ہ) گرجاتا ہے جیسے لڑکا سے لڑکوں، پردہ سے پردوں ۔ جمع مونث کا (اں) یا (ی ں) بھی (۔ وں) سے بدل جاتا ہے، جیسے لڑکیوں نے، دھونبوں نے ۔ جن الفاظ کے آخر میں (واو) ہوتی ہے، خواہ وہ مذکر ہوں یا مؤنث حرفِ ربط کے آنے سے ان کی جمع دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوتی ہے، یعنی آخر میں (۔ وں) بڑھادیا جاتا ہے جیسے جوروؤں، آرزوؤں، ہندوؤں ۔ اٹھارویں صدی سے (وں) کی جمع کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں:

انکھیوں (دا)، رقیبوں (دا) آرزوؤں (دا) محبتوں (دا) دشمنوں (دا) چھتیوں کے کواڑ (= چھاتیوں کے

کواڑ۔ دا)، کاندھوں (دا) گردنوں (دا)

شاہ حاتم کے دیوانِ قدیم میں (۔ وں) کی جمع پر مشتمل قافیہ میں ایک مکمل غزل موجود ہے۔ جس کا مطلب صاف ہے کہ ۱۷۲۸/۲۹ء سنۂ سے قبل (جو حاتم کے دیوانِ قدیم کی تکمیل کی تاریخ ہے) دہلی کا شاعر (وں) کی جمع کا عام طور پر استعمال کرنے لگا تھا۔

دل کیا ٹکڑے نَین ابرو کے تلواروں سیتی

کیوں اَڑے تھا جا کے یہ ہشیار مے خواروں سیتی

دیگر قوافی یہ ہیں : خاروں، چاروں، ماروں، یاروں، ایک اور غزل (ص ۱۲۰) کے قافیے نگاہوں، راہوں، شاہوں، آہوں اور گناہوں میں ایک دوسری غزل میں (ص ۱۹۱) میں انکھیوں، رقیبوں کے ساتھ ساتھ مفرد طور پر غزالاں، عاشقاں اور زلفاں غالباً فارسی کے زیر اثر (یاد کنی اردو کی لسانی روایت کے مطابق) استعمال کیا ہے۔ ایک دوسری غزل (ص ۱۸۴) میں فوجاں کماناں کے ساتھ ہندی بھنّاں استعمال کیا ہے (وں) کی جمع کس طرح (اں) کی جگہ اٹھارویں صدی کے نصف اوّل میں لے رہی تھی اسکا بہترین مظہر حاتم کے دیوان زاردہ (۱۷۵۵ء) کی اصلاحیں ہیں۔ دیوانِ قدیم (۱۷۲۸/۲۹ء) کی غزل کے ایک مصرعے کی اصلاح اس طرح کی گئی ہے :

دیوان قدیم : ع شوخ کی انکھیاں گلابی آج ہیں مثلِ شراب

دیوان زادہ : ع شوخ کی آنکھیں گلابی آج ہیں مثلِ شراب (ص ۱۰۶)

ایک دوسری غزل میں "انجھواں" کو بدل کر "آنسو" کردیا ہے (ص ۱۰۰)

مزید الفاظ : خطروں (حاتم (قدیم)، عاشقوں (حاتم (قدیم)،

ایک ہی قدیم غزل میں چشموں اور بھنواں (ص ۱۱۹)

شعر کی زبان عموماً روایت پسند ہوتی ہے، پھر دہلی کے متقدمین شعرا کے سروں پر ولیؔ کا بھوت سوار تھا لیکن اسی عہد کے نثر نگار فضلیؔ نے کربل کتھا (۱۷۳۲/۳۳ء) کی زبان میں اس بات کا مکمل ثبوت دیا ہے کہ اردو کی مسلّم جمع کا قاعدہ (وں) کا ہے نہ کہ (اں) کی علامت سے بنائی گئی ہے : اونٹاں (۲۱۸) اور گھاواں (جمع گھاؤ ۔۔ " گھاووانِ بے شمار۔ ص ۱۱۳)

ان کے برعکس فضلیؔ کا صیغۂ جمع ہمشہ (وں) کا ہوتا ہے : رخساروں ۴۷، جنوں ۴۷، مصیبتوں ۴۷، آنکھوں ۴۸ فرزندوں ۴۹، دشمنوں ۵۱، یتیموں ۱۳۶، گھروں ۴۷، لڑکوں ۶۰، اصحابوں (جمع الجمع جو بار بار آیا ہے) ۶۲، مردوں ۶ عورتوں (عموماً عورات استعمال کیا ہے) ۶۶، مومنوں ۶۷

ان الفاظ میں ہندی، فارسی یا عربی الفاظ کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی ہے جیسا کہ بعض اس دور کے شعرا کے یہاں مل جاتی ہے۔

قصہ مہر افرزودلبر (تقریباً ۱۷۵۴ء)میں جمع کی بیشتر شکلیں (وں) سے مرکب ہیں۔ البتہ ایک آدھ (اں) کی جیسے بھواں اور برج بھاشا کے تبتع میں ایک آدھ (ن) کی بھی مل جاتی ہیں جیسے : آنکھن (=آنکھوں) (ص ۱۱۹)۔

(وں) کی جمع کی بعض مثالیں :

بادشاہوں، امیروں، پتلیوں، جھولوں، پانوْؤں ، نادانوں ،محلوں ، خواروں ، درختوں ، پہلوں ، پھولوں ، پریوں، نصیببوں، دیووؤں، بنگلوں، پیاروں، بھالوں ، پھاکروں ، حوضوں ، نقاروں۔

ان میں ہندی ، فارسی یا عربی الفاظ کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی ہے۔

فائز کی زبان کے سلسلے میں مسعود حسن رضوی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " فارسی اور عربی لفظوں کی جمع فارسی قاعدے کے مطابق بغیر فارسی ترکیب کے بھی استعمال کی گئی ہے مثلاً زلفاں،حوراں، نظراں ، اس سے بڑھ کر یہ کہ ہندی لفظوں کی جمع اکثر فارسی قاعدے کے مطابق بنائی گئی ہے "

میرے خیال میں یہ لسانی توجیہہ صحیح نہیں ۔ دراصل " ان" کی جمع کا قاعدہ فارسی تک محدود نہیں یہ پنجابی اورہریانوی تک میں رائج ہے اور اس کا رشتہ قدیم پراکرت سے ملتا ہے۔ یہ محض ا تفاق ہے کہ اس اعتبار سے فارسی اور ہندوستان کی مذکورہ بالا بولیوں میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ دکن کے بعض محقیقن نے بھی، ہند آریائی زبانوں کے ارتقاکی تفصیلات پیشِ نظر نہ ہونے کی وجہ سے اسی قسم کا اظہار خیال کیا ہے، حالاں کہ جمع کی علامت (اِں) کی تفصیل ہند آریائی زبان کے ایک ماہر نے یہ بتائی ہے ۔

> " اَے آں ۔ مذکر (اَ) خاتمے والے الفاظ کے ساتھ جب جمع میں ، حالت کی جمع آتی ہے تو آخری (آ)، (آں) میں تبدیل ہوجا تا ہے۔ سنسکرتی مصّوتے کے خاتمے والے الفاظ کے ساتھ حالتِ اضافی کی جمع میں حالت کی علامت استعمال ہوتی ہے۔ پراکرت میں (آنام) (آنٹم) بنتا ہے۔ پراکرتوں میں حالتِ اضافی کی علامت کا استعمال دوسری حالتوں میں بھی کیا جاتا تھا۔ اپ بھرنش کے زمانے میں حالتِ اضافی کا استعمال دوسری حالتوں میں زیادہ ہونے لگا۔ سنسکرت کی حالتِ اضافی کی جمع کے لاحقے کو جدید ہند آریائی کی حالت کی جمع میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دکھنی میں حالتِ فاعلی کے علاوہ دوسری حالتوں میں (۔اں) کی علا متوں کی جمع میں حالتِ اضافی کی جمع کو بنیا د بنایا جا تا ہے۔ سنسکرت (آم) یا (آنام) پراکرتوں میں (آنٹم) بنتا ہے ، اور ہندی میں (انٹم) (اوْں) یا (اوں) کی شکل اختیار کرتا ہے۔ کچھ بولیوں میں یہ (آنٹم) (آں) میں تبدیل ہوتا ہے۔ "

دوسرے الفاظ میں اردو کے (وں = اوٗں) او (آں) جمع کی دونوں علامتوں کا مآخذ پراکرت کا (آنٹم) ہے۔ مختلف بولیوں نے مختلف علامتوں کو اپنا لیا۔ دکھنی، ہریانوی اور پنجابی میں یہ (اں) کی شکل میں ہے، قدیم اردو میں اٹھارویں صدی کے وسط تک اس کی دونوں شکلیں رائج رہیں، بالآخر کھڑی بولی کے (اوں= وں) کی فتح ہوتی ہے اور اس صدی کے آخر تک (آں) کی شکل اردو سے غائب ہوجاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ (اں) کے رجحان کو فارسی سے بھی تائید ملی ہوگی جب کہ بعض شعرا نے اکثر فارسی الاصل الفاظ کی جمع میں یہی علامت استعمال کی ہے۔

ع لگا ہے جان لباں کو مرے دہن تجھ بِن (آبرو)

لیکن اس بارے میں کوئی کلیہ نہیں بنایا جاسکتا۔ فارسی تراکیب میں تو یقیناً یہ فارسی کے زیر اثر کہی جائے گی لیکن فارسی کے مفرد الفاظ میں (اں) کی جمع کا مآخذ فارسی بھی کہا جاسکتا ہے اور ہندی بھی مثلاً حاتم کے قدیم دیوان میں زلفاں (ص ۱۳۴) بھی ملتا ہے اور زلفوں (ص ۱۴۹) بھی۔ زنجیرِ زلفاں (ص ۱۰۳) کی ترکیب بھی ملتی ہے، فائز کا ایک مصرع ہے۔

ع بھواں تیری شمشیر و زلفاں کمند (ص ۱۱۵)۔ یہاں یہ بتانا مشکل ہے کہ زلفاں میں (اں) علامت جمع فارسی کی ہے یا ہندی کی۔

(اں)کی جمع

مذکورہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہوگئی کہ (اں)کی جمع دکنی اردو کا غالب و نمایاں طریقۂ جمع ہے۔ آٹھارویں صدی کے نصف اول میں ابتدا میں آبرو، فائز، حاتم وغیرہ نے (وں) کی جمع کے ساتھ ا سے بھی بکثرت استعمال کیا ہے۔

بھواں (دا، ا ح، دف)، زلفاں (دا، ا ح)، لٹاں (دف) ہونٹاں، ہاتاں، باتاں، دانتاں (دف)، انکھیاں کی ردیف میں آبرو کے دیوان میں چار غزلیں ہیں (ص ۱۲۳)، انجھواں (ا ح)

ان شعراء کے برعکس اس عہد کے نثر نگاروں فضلی اور عیسوی خاں نے (اں) کی جمع کو صرف گاہ گاہ استعمال کیا ہے۔ کربل کتھا میں صرف، حاضراں، اور "گھاوانِ بے شمار" میں، گھاؤ، کی جمع لکھی ہے۔ قصہ مہر افروزو دلبر میں صرف، بھواں، ملتی ہے۔ رفتہ رفتہ شعر بھی ا سے "بموافق محاورہ شاہ جہاں آباد" نہ سمجھ کر اس سے اجتناب کرنے لگے۔ چنانچہ سوداؔ و میرؔ کے یہاں اس کا استعمال باقیات کے طور پر صرف فارسی اسماء یا صفات ضمائر اور حروف میں جھلک آتا ہے:

ع جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں (میر)

ع اس چرخ نے کیاں ہیں ہم سے بہت ادائیں (میر)

ع مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں (میر)

ع روتے گزرتیاں ہیں ہمیں راتیں ساریاں (میر)

اسمائے ضمیر

اٹھارویں صدی کے نصف اوّل میں ولیؔ کے اسلوبِ سخن کے زیر اثر دہلی کے شعرا اسمائے ضمیر کے استعمال میں بھی زیادہ محتاط نہیں دکھائی دیتے ۔ لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہی اور بہت جلد اس صدی کے نصف آخر سے ان میں استحکام آتا گیا۔

اس صدی کے نصف اوّل کے ضمائر کی جدول اس طور پر تیار کی جاسکتی :

ضمیر متکلم :

	واحد	جمع
فاعلی حالت	میں، ہم	ہم
مفعولی حالت	مج، مجھ، ہم	ہم، ہمن، ہمنا
اضافی حالت	میرا، مرا (۔ ری، رے)	ہم، ہمارا (۔ ری، رے)
	ہمارا (۔ ری)، ۔ رے)	ہمن، ہماروں
	مجھ، مج	

تشریحات

مجھ (= میرے)؛ " مجھ دل کو بہت ہے امید " (دف)، مجھ آشیانے کا (ک م)

ہمن (=ہم) ع کہ جس کی نگہ کے بندھے ہیں ہمن (دا)

ع دوری نہ کرو ہمن سے اس حد (دف)

ہمن (= ہمارے) ع ایک دم مہر کر ہمن حق میں (دف)

ہمنا (=ہم) " بولتا تھا ہمنا سیں " (دا)

ہماروں (ہمارے کی جمع) " پس قائم رکھو حکم ہماروں کو (ک ک ص ۵۴)

(نہایت شاذا ستعمال ہے جو کسی اور جگہ نہیں ملتا)

ہم (= میں) کے لیے موجودہ اردو کی طرح اس دور میں بھی پایا جاتا ہے۔

ہم (= ہمارے) ع محبت میں اگر ہم پاس آؤگے تو کیا ہوگا (ا ح)

اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں، نصف اول کی دو ضمائر متروک ہوجاتی ہیں " ہمن" اور " ہمنا" ۔ ان

کی جگہ جدید شکلیں " ہم " اور " ہمارا " کلی طور پرے لیتی ہیں ":

ضمیرحاضر

	واحد	جمع
فاعلی حالت :	تو ، توں ، تیں ، تم	تم
	تمن	
مفعولی حالت :	تج ، تجھ ،تم ،تمنا	تم ، تمن
اضافی حالت :	تیرا ، ترا(۔ ری ، ۔ رے)	تمہارا(۔ ری ، رے)
	تمہارا (۔ ری ، ۔ رے)	
	تمن ، تجھ	

تشریحات

توں (= تو) ، تو ، کی یہ انفی شکل اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں متردک ہوتی گئی ہے قائم عیسوی ، فضلی ، اور تحسین کے یہاں خال خال ملتی ہے۔

تَیں (=تو) : یہ ضمیر متکلم اس دور میں کمتر پائی جاتی ہے لیکن موجود ہے فضلیؔ کے علاوہ دیگر تمام شعراء و مصنفین کے یہاں۔ مثلاً عیسوی خاں کے یہاں مسلسل اور سودا اور میر کے یہاں خال خال ملتی ہے

" تَیں اس میں کردیا " (سودا) ، کلیاتِ میر فرہنگ)

(نوٹ پلیٹس نے اپنی قواعد تک میں (۱۸۸۴ء) ا سے متکلم اسمائے ضمیر میں شامل کیا ہے ، اس نوٹ کے ساتھ کہ اب یہ اردو میں متروک ہے)

تمن (= تم کو ، تمھیں) ع یہ نصیحت تمن ہماری ہے (فائز)

تم (= تمھارا) (فائز)

تمھاروں (ضمیر متکلم جمع) ، ہماروں ، کی طرح صرف کربل کتھا میں آئی ہے۔

تمن (= تیرے) " تمن پاس " (دف) ، تجھ (= تیرے) " تجھ حکم " (ک ک) ، " تجھ لباں " (دا) ، " تجھ قد" (دن) تجھ لب (دف) ، تجھ پاس (ک م) ، " تجھ انکھیاں " (ا ح) تمنا (= تم) (دا)

ضمیرغائب

	واحد	جمع
حالت فاعلی:	وہ ، اُن نے ، دو ، اُو	وہ ۔ وے

حالت مفعولی :	اس، اُنھوں ،اُن	اُن ، اُنھوں ، دِن،تِن
	وِس ، وِ سے	
حالت اضافی :	اِس کا ، وِس کا ، تِس کا	ان کا ، ان کی

وے (=وہ جمع)۔ ۔ جمع کی یہ ضمیر حاتم ، فائز ، عیسوی ، تحسین ، سودا ، میر ، سب کے یہاں ملتی ہے۔
" وے وے کام سرانجام پائے " (ن ط م)

وِس (=اُس) فضلی عیسوی اور مراثی ریختہ میں ملتا ہے۔ دہلی کی بولی کا عوامی تلفظ ہے۔

وِ سے (=اُ سے) : عیسوی خاں

اُن نے (=وہ) "اُن نے بھی ہنس دیا" (ن ط م)

تِس کی (اُس کی)" تِس کی دعا سے تیریں اولاد بھی ہوگی اور جیوے گی بھی " (ق م د)

تِن (=اُن) " تِن سبھوں کو سرکار سے بادلہ پوش کردیو (ق م د)

ضمیر موصولہ

	واحد	جمع
فاعلی حالت :	جو	جو
مفعولی حالت :	جس، جن(تعظیماً)	جن ، جنہوں ، جنھیں
	جس کا	جن کا
	جس کی	جن کی

تشریحات

جن (بغیر، نے، فاعلی) : " جن کیا" (مراثی ریختہ) ، " جن سکھایا " (دف)

ضمائر استفہامیہ

	واحد	جمع
حالتِ فاعلی :	کون	کون
حالت مفعولی :	کس ، کِن	کن
حالت اضافی :	کس کا	کن کا

ضمائر تنکر

مفعولی حالت میں، کسی، کے ساتھ "کسو" کا استعمال قابل توجہ ہے یہ مسلسل آیا ہے ، فضلی عیسوی

خاں تاؔمؔیر اور غالبؔ سب نے استعمال کیا ہے :

"کسو پر نہ کیا (ک ک)، ع ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا (میر)

ضمیر اشارہ (قریب)

	واحد	جمع
حالتِ فاعلی :	یہ - یو	یہ، یے
حالت مفعولی :	اس، اِن	اِن، انھوں، انو
	اِسے، اِنھیں	اِنھیں
حالت اضافی :	اس کا، ان کا	اِن کا

یہ (یہ جمع) (دا) " یے بھی روتے ہیں " (ق م د)

یو (یہ) : ع یورخسار کے مطلعِ نور پر (دا)

" یو دیکھ "(ق م د) (دف) (ک ک)

ضمیرِ اشارہ (بعید)

	واحد	جمع
حالت فاعلی :	وہ، وو، اُو	وہ، وے، وو
حالت مفعولی :	اُس، وِس،	اُن، وِن، انھوں، اُناں
	اُن، انھوں	

وے (جمع وہ) (ا ح) (ق م د)، " وے وے کام انجام پائے " (ن ط م ۱۰۳)(لیکن فضلی کے یہاں نہیں ملتا) اس کے بعد سودا اور میر کے پاسپھر موجود ہے۔

اُناں (اُن جمع) " اُناں میں ایک تھی " (دف)

وِس (=اُس)" وِس سے کہتی ہے " (ق م د)

اُنھوں (=اس (تعظیماً)میں نے کہاں انھوں سے " (سودا)

افعال

مصد ر

موجودہ اردو میں علامت مصدر " نا " ہے لیکن قدیم اردو اور اٹھارویں صدی تک کی اردو میں بعض دیگرطریقوں سے بھی مصدر کی تشکیل ہوتی تھی۔ ایسے مادّے جو مصوّتوں پر ختم ہوتے ہیں اکثر" نا " سے قبل ان

میں ایک (و) کا اضافہ کردیا جاتا تھا مثلا

جاونا (ک ک۔۱۳۲)، پیونا (ک ک۔ ۱۸۹) کھاونا (ک ک۔ ۲۳۳)، گاونا (ق م د۔ ۲۹) آونا (ق م د۔ ۶۱)

اٹھارویں صدی کے نصف آخرمیں یہ شکلیں غائب ہوجاتی ہیں، مصدرکا "نا" اکثر انفی شکل بھی اختیارکرلیتا ہے :

مارناں (ق م د۔ ۵۳) ، نکالناں (ق م د۔ ۳۳۷)

حالیہ تمام

معیاری اردو میں یہ مادّے کے آخر میں (۔ تا) لگانے سے بنتا ہے لیکن اٹھارویں صدی تک کی اردو میں (۔ تا) سے قبل ایک (و) کا اضافہ بھی کردیا جاتا تھا۔

پاؤتا (دا، ص ۵۷) رودتا (ق م د)، ص ۲۰۲)، جلاوتا (ق م، د ص ۲۰۵)

حالیہ تمام کے جمع مونث صیغے میں چند شکلیں اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہیں کہ موجودہ اردو میں وہ متروک ہوچکی ہیں۔ مثلاً مادہ "جا" اور "بول" سے :

جاتیں، جاوتیں، جاوتیاں، بولتیں، بولتیاں

روتیاں (ک ک ۱۶۴)، کہتیاں (ک ک۔ ۸۸)

جاتیاں (ک ک ۲۴۰) (س۔ ب ۲۷) پلتیاں (ک ک۔ ۵۶۶)، بھاگیاں (ک ک ۲۱۷) دیکھیاں (ک۔م ۲۲۱)، جلتیاں (ک م۔ ۵۶۶)، آئیاں (ک م۔ ۲۱۷) چلیاں، دیکھیاں (ک۔ م ۲۲۱)، آتیاں (س ب۔ ۲۷)

ماضی مطلق

موجودہ اردو میں ماضی مطلق کی تشکیل کے لیے مادّے میں (۔ ا) کا اضافہ کردیا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں کھڑی بولی کی یہ شکل ابتدا سے مستعمل رہی ہے۔ دکنی اردو میں ماضی مطلق (۔ یا) کے اضافے سے بنتا ہے جونواحِ دہلی کی بولیوں میں ہریانوی کی خصوصیات ہے۔ شمالی ہندکی اردو میں اس کی مثالیں صرف اسمٰعیل امروہوی کی "اردو کی دو قدیم مثنویاں" میں ملتی ہیں۔

بھریا (۱۰۴، ۱۰۹)، پڑھیا (۱۰۵)، کہیا (۱۰۶، ۱۱۹)، ملیا (۱۱۰)، دیکھیا (۱۱۲، ۱۴۴، ۱۱۹)، رہیا (۱۱۵)۔

لیکن اسمٰعیل کی زبان میں دکنی اردو کی پٹ کافی مل جاتی ہے اس لئے کہ اس کی عمر کا بڑا حصّہ عالمگیر کے عہد میں نواحِ اورنگ آباد میں گزرا تھا۔ وہ شمالی ہند کا واحد مصنف ہے جو دکنی اردو کی (چ) تخصیصی کو بھی استعمال کرجاتا ہے۔ اس کے یہاں دکنی اردو کی یہ شکلیں بھی مل جاتی ہیں :

پائیا (دق م۔ ۱۲۵)، آئیا (دق م۔ ۱۵۸)، لائیا (د ق م۔ ۱۵۸)، وہ واحد مصنف ہے جو امدادی افعال کے طور پرا تھا (تھا) اور اتھے (تھے) کو استعمال کرتا ہے۔ شمالی ہند کی اٹھارویں صدی کی اردو میں یہ ناپید ہیں، حالاں کہ عاشورنامہ (۱۶۸۸ء) میں ان کا استعمال پایا جاتا ہے۔

صیغۂ امر

صیغۂ امر میں خاص اختلاف (و) کے اضافے کا ہے جب مادّہ کا خاتمہ مصوتے پر ہو، جیسے :

" بُھلادوں نہیں " (حرف۔ ۲۴۷)

ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ امر کا تعظیمی صیغہ آئیے وغیرہ " آپ " کے علاوہ تَیں (تو) کے ساتھ بھی استعمال کیا جاتا تھا، جیسے :

"کلّھ تیں نہ آئیے " (ق م د۔ ۸۹)

" تَیں تب آئیے " (ق م د۔ ۹۸)

اسی طرح اگر مادّہ کا خاتمہ مصمتے پر ہو تو اس کے آخر میں (یو) اور مصوتے پر ہو تو آخر میں (اِیو) لگادیا جاتا ہے۔

مِلیو (ک ک۔ ۲۷۶)، کہیو(ک ک ۔ ۱۱۵)، جییو (ک ک ۔ ۶۵)، دیجیو (ک ک ۔ ۳۶)، ہو جئے (ک ک ۔ ۱۴۳)، ہوئیے، کے بجائے کربل کتھاتا غالبؔ مستعمل رہا ہے۔

ع نہ کھڑے ہو جئے خوبانِ دل آزار کے پاس (غالبؔ)

ان افعال کی مختصر شکلیں بھی مستعمل رہی ہیں۔

دیجیے (ق م د ۔ ۳۶) کیجے (ق م د ۔ ۳

مضارع

متداول شکلوں کے علاوہ (و) کے اضافے سے بھی رائج رہی ہیں :

ہووے (ک ک۔ ۶۰)، دیوے (ک ک۔ ۲۰۱)، چھپاوے (ق م د۔ ۳۳۱)، لیوے (ق م د۔ ۳۲۹)

اردو میں صیغۂ حال کی علامت (۔ تا) کی مختلف شکلیں ہیں۔ اِس اعتبار سے اردو (کھڑی) ہریانوی سے بالکل مختلف ہے جہاں (سوں۔ ساں۔ سو) کے ہیر پھیر سے حال بنتا ہے۔ حال کی یہ شکل اردو نے اپنے ارتقا میں کبھی نہیں اپنائی۔ ا سے دکنی اردو کے (س) سے مرکب مستقبل سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔

مستقبل

اس دَور کی اردو میں مستقبل کی سب سے دلچسپ شکل جمع مؤنث میں ملتی ہے، جہاں دیگر زبانوں کی طرح علامتِ مستقبل بھی اسی کے مطابق آتی ہے۔

" ہم بغیر تیرے دنیا میں کیوں کر پھریں گیاں۔ " (ک ک۔ ۸۹)

بغیر ترے دیدار کے کیوں کر زندگی کریں گیاں۔ " (ک ک۔ ۸۹)

(۔گیان) کی یہ شکل کربل کتھا سے مخصوص ہے۔

مستقبل کے صیغے کے مانند (و) زائدہ کے ساتھ بھی آتے ہیں۔ بتلاوے گی (ق م د۔ ۱۰۹)، جیویگی (ق م د ۔ ۱۳۱)، ہوویگا (ک ک ۔ ۵۷۸) جاویں گے (ک ک۔ ۱۳۹)، آوے گی (ک م۔ ۴۰۰)

مستقبل کی علامت (۔گا) سے کبھی کبھی زمانۂ حال کا بھی کام کیا جاتا ہے ۔ یہ عام طور پر امدادی افعال کے آگے لگادیا جاتا ہے، جیسے :

" ہم جاتے ہیں گے اپنے گھر" (ک ک ۔ ۱۴۱) " آگے جاتا ہوں گا " (ک ک ۔ ۱۰۶)

فعل کی یہ شکل میر تقی میؔر بلکہ ان کے بعد تک معیاری سمجھی جاتی تھی۔ اب بعض علاقوں میں صرف بول چال میں رہ گئی ہے ۔ پلیٹس نے اپنی قواعد (۱۸۸۴ء) تک میں اس کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ " ہے " کے مقابلہ میں " ہیگا" میں زیادہ زور اور تاکید پائی جاتی ہے ۔

ماضی مطلق

سب سے قابلِ توجہ شکل جمع مونث کی ہے، جہاں فعل دیگر زمانوں کی طرح فاعل کے مطابق آتا ہے " کئی عورتیں نکلیاں " (ک ک ۔ ۸۱)، " خیموں سے باہر بھاگیاں " (ک ک ۔ ۲۱۷)

میر تقی میؔر نے تو اس قواعدی شکل کو ردیف بنا کر ایک غزل لکھی ہے :

بار ہاد وعدوں کی راتیں آئیاں　　طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں

عشق میں ایذائیں سب سے پائیاں　　رہ گئے آنسو تو آنکھیں آئیاں

اُس مژہ برہم زدہ نے بارہا　　عاشقوں میں برچھایاں چلوائیاں

اس غزل کے مزید قوانی یہ ہیں : مرجھائیاں، جھمکائیاں، ٹھہرائیاں، کھائیاں، بتلائیاں، دلوائیاں، (ک ۔ میر ۵ / ۱۰۴۔ نولکشور)

انیسویں صدی آتے آتے یہ صیغہ متردک ہوجاتا ہے اور ان کے بجائے : آئیں، دکھلائیں، چلوائیں وغیرہ مستند مانے جانے لگے۔

متعلق فعل

اُس دَور کے حسبِ ذیل متعلق فعل خصوصیت رکھتے ہیں :

یاں : غم بہت ہے یاں " (ک م ۔ ۲۲۶)

تہاں :(=وہاں)"تہاں یہ رہی تھی " (ق م د ۔ ۸۸)

ایدھر: (=اِدھر)" نہ ایدھر گزر کیا " (د د ۔ ۱۱۳)

جدھر تدھر: " پھرتے تو ہو۔ ۔ ۔ جدھر تدھر (د د۔ ۸۸)

ووں: (=اس طرح) " ووں ہی ندائے الٰہی ہوئی " (ک ک۔ ٦١)

اودھر: (=اُدھر۔ ک ک)

تدھر: (=وہاں) ع جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رُو تھا (ک م۔ ۱۳۳)

پھیر (= پھر)(ک ک۔ ص ۹۰)

کلّھ: (=کل)" کلّھ توتیں نہ آئے " (ق م د ۔ ۸۹)

آگوں: (=آگے)" آگوں اس کے ایک حوض ہے " (ق م د۔ ۲۲)

آنگو: (=آگے) "تب آنگو تو روپے لٹتے جاتے تھے " (ق م د۔ ۸)

تُرَت: (= جلدی)

نپٹ: (بہت)" ایک باغ نپٹ خوبی کا تیار کیا " (ق م د۔ ۵۱)

دَھک: (=اچانک) " دھک جا کے اس کی بانہہ کو پکڑا " (د ف۔ ۲۰۸)

نئیں: (= نہیں)

ناہیں: (=نہیں) ع شہر دلّی میں ثانی اب ناہیں (د ف۔ ۱۹۸)

('نہیں' کا استعمال کم تر رہا ہے)

ہمیش: (=ہمیشہ)" ہمیش آرزو مند مرگ کا تھا " (ک ک ۔ ۸۳)

اب لگ: (=اب تک) " اب لگ توں کہاں تھا " (ک ک ۔ ۱۲۳)

جد: (=جب) " اور جد تیرے بیٹا ہوئے " (ق م د ۔ ۷)

تَوَلَوں: (=کبھی) " تَوَلَوں اس عورت نے کہا " (ق م د ۔ ۱۹)

کدھو: (=کبھی) " انھوں نے کدھو نہیں دیکھے تھے " (ق م د ۔ ۱۹)

کد: (=کب) " اس شہر بیچ کد ہے عید اور شادی ، نہ معلوم ہوتی تھی " (ق م د۔ ۱)

ایتا: (اتنا) " بادشاہ زادہ ایتا خوبصورت ہے" (ق م د ۔ ۱۱)

تلیں: (=تلے) " اُس پانی کے تلیں۔ ۔ ۔ " (ق م د ۔ ۲۳)

سانمنھے (=سامنے) " سانمنھے پہاڑ کے اوپر۔ ۔ ۔ " (ق م د۔ ۲۴)

حروف

سیں : (= سے ، دف)

سیتی : (= سے) ع سر ہاتھ دھر، کیوں کر نہ روؤں ، دھو ہاتھ بیٹھی تجھ سیتی (ک ک۔ ۱۹۱)

سو ں : (= سے) "اُس ہاتھ سوں " (دف۔ ۲۴۰)

تے : (= سے)

نِیں : (= نے) "کیا ہے فتح ہم نیں " (د آ۔ ۱۴۱)

لک ، لگ : (= تک) " جب لگ توں مجھے مارے " (ک ک ۔ ۲۳۱)

لُوں ، لَوں : (= تک)"تب لَوں " " (ق م د)

کو، کو، ں : ، کوں ، کثرت سے ، دیوانِ آبرو ۔ دیوانِ حاتم ۔

دیوانِ فائز اور قصّہ مہر افروز ودلبر میں استعمال ہوا ہے۔

قصہ مہر افروز و دلبر میں ، کو، اور ،کوں ، دونوں شکلیں ملتی ہیں۔

کَے : (=کو)" اور اس سوداگر کے رخصت کرتا " (ق م د ۔ ٦٣) (" کے" قصہ سے مخصوص ہے۔) بار بار آیا ہے ۔ برج کا لفظ ہے)

موں : (= مِیں) " دل موں میرے :" (ک ک ۔ ۱۹۲)

منے : (= مِیں ، دف)

بی: (= بھی) دیوان فائز میں اکثر غیر نفسی " بھی" کے طور پر آتا ہے۔

لیئیں : (=تک) " پرناز کی گوشت لیئیں ہے " (ق م د۔ ۴۴)

(اس کا استعمال قصّہ کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا۔ بولی کا لفظ ہے)

نحوی خصوصیات

اٹھارویں صدی کی اردو کا بیشتر مواد شاعری پر مشتمل ہے۔ آبرو، حاتم ، فائز سے لے کر سودا ومیر تک بے انتہا اور بیش بہا شعری سرمایہ جمع ہوگیا ہے ۔ لیکن ایک تو شعر کی زبان محدود مخصوص ہوتی ہے ۔ دوسرے نحوی ساخت کے اعتبار اس میں الفاظ کی ترتیب ضرورتِ شعری کے اعتبار اے اُلٹ پلٹ کی جاسکتی ہے۔

جہاں تک اس صدی کی نثر کا سرمایہ ہے ہمارے پیشِ نظر چار اہم تصانیف رہی ہیں۔ (ا)فضلی کی کربل کتھا (۱۷۳۳ ء)،عیسوی خاں کا قصئہ مہر افروز و دلبر (تقریباً ۱۷۵۴ ء)، تحسین کی نو طرز مرصّع (۱۷۷۵ء)اور میرامن کی باغ وبہار (۱۸۰۲ء)

ان میں کربل کتھا ایک آزاد ترجمے اور تلخیص کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس کے جملوں میں الفاظ کی ترتیب پر فارسی کی نحوی ساخت کا گہرا اثر ملتا ہے ۔

" ناگاہ داخل ہوئے اس محل میں پانچ مرد" (ک ۔ ک ۔ ۲۶۳)

تحسین " مرصع رقم " تھے اور انھوں نے " مرصّع رقم " تھے اور انھوں نے " مرصّع ہندی زبان " جنرل اسمہ ڈ کی دلبستگی کے لئے لکھی ہے جس کا مآخذ فارسی کا چہاردرویش" کا قصّہ ہے ۔ تحسین نے اس قصّے کو بطور " اِنشا " رقم کیا ہے جیسا کہ اس کے ایک معروف نام " انشاء نوطرزِ مرصّع " سے بھی ظاہر ہوتا ہے گلکرسٹ نے میر امن کے باغ وبہار کے اپنے دیبا چے بزبان انگریزی میں لکھا ہے ۔

> " عطا حسین خاں نے ابتدا اصل فارسی سے اس کا ترجمہ شائع کیا گیا مگر چونکہ اس کی زبان بوجہ کثرتِ تراکیب ، محاورہ ، فارسی و عربی مغلق اور قابلِ اعتراض مانی گئی تھی اس لئے اِس نقص کو رفع کرنے کی غرض سے کالج کے ملازمین میں سے میر امن دہلوی نے مذکورہ بالا ترجمہ سے موجودہ متن تیار کیا ہے ۔ "

ایک لحاظ سے نحوی ساخت کے تجزیے کے لئے سب سے مستند مآخذ عیسوی خاں کا قصّہ مہر افروز و دلبر ہے جو ۱۷۵۴ء کے قریب کی زبان کی نمائندگی کرتا ہے اور دوسری میر امن دہلوی کی باغ و بہار ہے جو ۱۸۰۲ء کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے تحسین کی "مرصّع ہندی" کو " اردوئے معلّیٰ " کی زبان میں باغ وبہار بنایا۔

(الف)جملے میں الفاظ کی ترتیب ۔

اُردو جملے میں فاعل فعل سے پہلے آتا ہے اگر فعل لازم ہو ، لیکن اگر جملے جملے میں فعل متعدی ہو تو پہلے فاعل ، اس کے بعد مفعول اور اس کے بعد فعل ہوتا ہے ۔

اٹھارویں صدی کی اردو میں فارسی عربی نحوی ساخت کے زیرِ اثر یہ ترتیب اکثر بدل جاتی ہے :

(۱) " ناگاہ داخل ہوئے اُس محل میں پانچ مرد " (ک ک ۔ ۲۶۳)

(۲) " باغبانِ قضاوقدر کے نے بیچ روزِازل کے "(ن ط م ۔ ۶۷)

(۳) "گلِ عشرت اس کے کا "(ن ط م ۔ ۶۵)

(۴)"اور کہا کہ بیچ غسلِ صحت اس کی کے جس قدر جلدی کرے گا موردِ عنایاتِ بے غایات ہوگا ۔ " (ن ط م ۔ ۲۷۳)

(۵)"اسباب تجارت کا بہت سا لایا ۔ " (ب ب ۔ ۱۱۶)

(٦) "اگر تھوڑا سا احوال اس کا مفصّل بیان کرو۔" (ب ب۔ ۴۲)

نحوی ترکیب کا یہ گنجلک اور زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے جب جملہ طویل ہوتا ہے اور اس میں کئی تابع جملے ہو تے ہیں، جیسے :

"یہ غریب مسافتِ بعید سے معشوقہ اپنی کو، کہ مدار زندگی میری کا اوپر مشاہدہٴ
جمال مہر تمثال اس کے ہے، ساتھ لئے بہ تہیّہ روزگار تجارت پیشگی کے اس
طرف کو آتا تھا جب۔۔۔"

(ن ط م)

نوطرز مرصّع (۱۷۷۵ء) اور باغ و بہار (۱۸۰۲) کی مذکورہ بالا مثالوں کے برعکس قصّہ مہر افروز و دلبر (۱۷۵۴ء) کے جملوں کی نحوی ساخت عام بول چال کی اردو سے قریب تر ہے۔ صرف کہیں کہیں حروفِ ربط کا استعمال فارسی نحو کا اثر لئے ہوئے ہیں۔ (ص ا)

"اقلیم ہندوستان کی میں ایک شہر تھا کہ تس کا نانوْ عشق آباد تھا۔ تِس میں حکم روا اُس جگہّ کا عادل شاہ بادشاہ تھا۔ ہفت اقلیم کے جوہر ایک بادشاہ تھے سو پیش کش اور نوکری اس کی کے میں سب حاضر رہتے تھے۔ اطاعت اس کی مانتے تھے۔ جہاں تک کہ ملک اس کا تھا، سو عدالت و انصاف اور بخشش و انعامات سے کوئی ایسا نہ تھا کہ کسی بات سے محتاج ہوئے۔ اور اس شہر کے بیچ میں کد ہے عید اور شادی، نہ معلوم ہوتی تھی، کیوں کہ عید اور شادی رات دن رہتی تھی، اور چھوٹا بڑا جو اس شہر میں رہتا تھا سو سوائے راگ اور ناچ، عیش وعشرت کے اور دوسری بات نہ جانتا تھا۔۔۔۔"

مذکورہ بالا تمام مثالوں میں حروفِ اضافت (کا، کے، کی) کا استعمال فارسی نحوی قاعدے کے مطابق ہوا ہے۔ اس سے مفر عیسوی خاں، مصنفّ، قصّہ مہر افروز ودلبر، کو بھی نہ تھا۔

"اور نوکری اس کی کے میں سب حاضر رہتے تھے"

جو اردو کے قاعدے کے مطابق "اور اس کی نوکری میں سب حاضر رہتے تھے" ہونا چاہیئے تھا۔ مزید مثالیں

"چھوٹی بیٹی امام کی سے" (ک ک۔ ۲۱۷)

"شبستانِ عمر و دولت اس کے کا" (ن ط م۔ ٦۵)

"لائق میری نذر کے" (ب ب۔ ۱۱٦)

(ب) ترتیبِ کلام

(ا) فاعلی، نے، کے حذف سے اس صدی میں ترتیبِ کلام میں فرق پڑجاتا تھا۔ یعنی متعدی فعل ایسی صورت میں اپنے فاعل کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے نہ کہ مفعول کے ساتھ :

۱۔ " وہ دونوں بات سنے " (یعنی ان دونوں نے بات سنی) (ک ک۔ ۱۲۵)

۲۔ " وہ جواب نہ دی " (یعنی اس نے جواب نہ دیا) (ک ک۔ ۱۲۴)

۳۔ " تب عباس کہے " (یعنی تب عباس نے کہا) (ک ک۔ ۱٦٦)

(۲) فاعل جمع مونث ہو تو اس کا فعل بھی اس کے تابع آئے گا۔

۱۔ "کشتیاں سر بہ مہر بیچ نظر مبارک ملکہ ماہ سیا کے گزارنیاں (ن ط م۔ ۹۳)

۲۔ " ع نگاہوں سے نگاہیں سامنے ہوتے ہی لڑیاں (ن ط م ۔ ۸۵)

۳۔ " یہ باتیں ہوتیاں تھیں کہ۔ ۔ ۔ " (ب ب۔ ۱۱۱)

۴۔ " رنگ بہ رنگ کی پوشاکیں پہنے ہوئے سینکڑوں پری پیکریں جھولیتاں ہیں۔ "(آم۔ افسوس)

۵۔ بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں طالعوں نے صبح کر دکھلا ئیاں

عشق میں ایذائیں سب سے پائیاں رہ گئے آنسو تو آنکھیں آئیاں

(میر)

(۳) فاعل جمع مونث ہو تو صفت بھی جمع کی شکل اختیار کرے گی۔

ع نہ میں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں۔ (سودا)

(۴) اردو نحو کا عام قاعدہ ہے کہ صفت اسم یا ضمیر سے پہلے آتی ہے لیکن اکثر فارسی قواعد کے زیرِاثر اس عہد میں یہ ترتیب اُلٹ جاتی ہے۔

۱۔ " باپ ہمارے نے " (ک ک۔ ۱۲۴)

۲۔ " اور جانور اقسام طرح خوشرنگ بیٹھے ہیں۔ " (ق م د۔ ۱٦)

اختتامیہ

انیسویں صدی کے آغاز تک اردو زبان اپنی صوتیات ، صرف ونحو اور کِسی حد تک لفظیات کے نقطۂ نظر سے ایک ایسی شکل اختیارکرچکی تھی کہ دہلی اور اس کے باہر کے شعرا اورادیب اس کا تتبع کرنا اپنافرض سمجھتے تھے ۔ ۱۷۹۳ ء میں مرزاجان طپش دہلوی نے ڈھا کہ میں بیٹھ کر وہاں کے نواب کے حکم سے ایک مختصرسی لغت " شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان " مقامی شاعروں کی رہنمائی کے لئے لکھی ۔ سید انشاء اللہ خاں انشاؔ نے ۱۸۰۸ ء میں اردوصرف و نحو پر ایک "جامع اور بے مثل" کتاب لکھی کہ " اردو زبان کے قواعدٗ محاورات اور روزمّرہ کے متعلق اس سے پہلے کوئی ایسی مستند اورمحققانہ کتا ب نہیں لکھی گئی تھی۔ " انشاؔ کی

اس تصنیف سے اِس بات کاعلم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فصیح اور غیر فصیح کا معیار کیا تھا۔ ان کے خیال میں اگرچہ شاہ جہاں آباد (دہلی) کی زبان مستند اور فصیح ہے لیکن یہ بھی محلّہ بہ محلّہ بدلتی رہتی ہے مثلاً انشا کے بقول دہلی ہی میں مغلپورہ کے رہنے والے "باتیں" کے بجائے "باتاں"، "تلواریں" کے بجائے "تلواراں"، "لگائیں" کے بجائے "لگائیاں"، "تھیں" کے بجائے "تھیاں"، "تیرے تئیں" کے بجائے "مجھ تئیں" (کہ فصیح اس کو "مجھے" بولتے ہیں)، "تیرے تئیں" کے بجائے "تجھ تئیں" (کہ فصیح اس کو "تجھے" بولتے ہیں)، ہمارے تئیں کے بجائے "ہم تئیں" (کہ فصیح اس موقع پر "ہمیں" بولتے ہیں) استعمال کرتے ہیں اور اِسی طرح "اس طرف" "مجھ طرف" "آپ طرف" کی بجائے "اس کی طرف" "میری طرف"، "آپ کی طرف" استعمال کرتے ہیں۔ اور اسی طرح یہ لوگ "کی" کہ علامتِ اضافت ہے ہمیشہ حذف کردیتے ہیں۔ دریائے لطافت میں انشاء اللہ خاں نے نہایت احترام کے ساتھ میر تقی میؔر کے "لہجہ اکبر آباد و شمولِ الفاظِ برج وگوالیار در وقتِ تکلّم" کی شہادت دی ہے۔

غرضکہ دہلی ہی میں زبان کی نوک پلک درست ہونے کا عمل شروع ہوگیا تھا۔ کم ازکم فصحائے دہلی اس سے باخبر تھے لیکن شیخ امام بخش ناسخ (م: ۱۸۳۸ء) اور ان کے متبعین کے یہاں زبان کے غیر معیاری ہونے کا شعور تیز تر ہوگیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں حسب ذیل اصلاحات قابلِ توجہ ہیں۔

(۱) مضارع کے لئے (ـتا) اور اس کی شکلیں متحکم ہوجاتی ہیں۔ (جاتا ہے۔ کھاتا ہے۔ چلتا ہے اور جائے ہے۔ کھائے ہے۔ مارے ہے۔ متروک ہوجاتے ہیں۔ (حالاں کہ غالبؔ نے اپنی مشہور غزل اسی ترکیب سے لکھی ہے۔

ع کھینچتا ہوں جس قدر مجھ سے وہ کِھنچتا جائے ہے)۔

بعض علاقوں کی بول چال کی اردو میں یہ تا حال مروج ہے

(۲)(و) زائدہ سے مرکب افعال کی مختلف شکلیں متروک ہونے لگتی ہیں۔ جیسے دیوے۔ لیوے۔ ہووے۔ ہوویگا۔ دیویں گے۔ لے لیویں گے۔

(۳)علامت (گا۔ گی۔ گے) کا مضارع کے لئے استعمال قطعاً متروک ہوگیا۔ ہے گا (= ہے) ہیں گے (=ہیں) (ہر چند بعض علاقوں کی عوامی بولی میں یہ آج بھی شمالی ہند میں سننے میں آتی ہیں)

(۴)مونث جمع اسم سے فعل کا متاثر ہونا جو میرامن، شیر علی افسوس اور اس عہد کے دوسرے مصنفین کے یہاں مستعمل رہا ہے، متروک ہوجاتا ہے: "بہتیاہیں" کے بجائے "بہتی ہیں" "گھٹائیں چھائیاں" کے بجائے "گھٹائیں چھائیں۔"

(۵) کرئیے کے بجائے "کیجئے"، ہو جے" کے بجائے "ہوجیئے" اور پھر "ہوئیے"، کیجوُ" کے بجائے "کریو۔"

(۶) اسمائے ضمائر میں حسب ذیل متروک ہوجاتے ہیں:

تَیں (تو) ، اُن نے (اس نے)، تجھ بن (بے تیرے) ، جن نے (جس نے)، تجھ تیغ (تیری تیغ)، تس پر (اس پر) ، تجھ (تجھ کو) ، مجھ (میرے)، میں (میں نے) ، تس پر (اس)ہم ہی نے (ہمیں نے)، کسو (=کسی)، وے (=وہ، جمع)، یے (=یہ، جمع)

(۷)حروف میں حسب ذیل متروک ہو گئے :

" آگو" (=آگے)، سیتی (= سے)، کبھو(=کبھی)،بیچ (=میں)، اُپر(=اوپر)، لیک(=لیکن)، ندان (=ہمیشہ)،جوں (=مثل) ،تد (=تب)، نت (=ہمیشہ)، پرے(=الگ)، بِن (=بغیر)، تدِھر(=اُدھر)،ایدِھر(=اِدھر)، مت (= نہ)، نت (=ہمیشہ)، سمیت (=ساتھ)

(۸)اسماء میں مخصوص اسماء جو عرصۂ دراز سے مستعمل تھے متروک قرار پا ئے :

دِوانہ(=دیوانہ)، جگ (=دنیا)، پَوِن(=ہوا)، پات (پتّا)، سجن (=صنم)، کھوج (=نشان)، جاگہ (= جگہ)،ماٹی (=مٹی)، دارو(=دوا۔ شراب)، شورشرابا(= شوروغل)، پرواہ (=پروا)، نشہ (=نشّہ)، لوہو(=لہو)، پتنگ (=پتنگا ، پروانہ)، جائے (=جگہ،جا)، پھتروں (=پتھروں)

دہلی میں غالبؔ اور لکھنؤ میں میرانیسؔ نے زبان کی اس اصلاح کا ہمیشہ تتبع نہیں کیا ہے ۔ غالبؔ نے کسو (ع یاں توکوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی)ہوجئے باند ھے ہیں۔ اور' جائے ہے' کی ردیف میں ایک غزل کہی ہے۔ ان کے خطوط میں 'بوڑھا، 'گاڈی' اور'سونچ' بھی ملتے ہیں ۔ اسی طرح میرانیس نے خاندانی محاورے کا پاس کرتے ہوئے 'آئیاں ، جائیاں ، بجائیاں ، باندھا ہے اور " جگہ " کے بجائے " جاگہ" لکھتے رہے۔ لیکن اصلاحِ زبان کے اثر سے بالآخر یہ دونوں بھی دامن نہ بچا سکے۔ مرزا غالب نے جا بجا لکھنؤ اور رجب علی بیگ سرور لکھنوی کی زبان دانی کا اعتراف کیا ہے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ سرسید کے زمانے تک قواعدِ زبان کی پابندی سختی سے نہیں کی جاتی تھی۔ "الفاظ کی بے ترتیبی عام تھی ، اردو فقروں پر اکثر دھوکا ہوتا تھا کہ فارسی کا ترجمہ ہیں۔ مضاف الیہ کو اکثر مضاف کے بعد لکھتے اور بولتے تھے۔ متعلقاتِ فعل کو فعل کے بعد رکھ دیتے تھے۔ " فارسی محاورات کے ترجمے اب تک مستعمل تھے ۔ سرسید نے"وے" (جمع وہ) کا استعمال رَوا رکھا اور' کرکے' کے بجائے 'کرکر' آخر وقت تک لکھتے رہے۔ انہیں سے بدعت انگریزی الفاظ کے استعمال کی چلی۔ ان کے معاصرین جو انگریزی میں بس شدبُد رکھتے تھے ، اس کے الفاظ بے دھڑک استعمال کرنے لگے صحافت نے اِس رجحان کو مزید تقویت دی۔

انیسویں صدی کے ربع آخر تک اردو قواعدکی نوک پلک کی درستی ہوتی رہی اور ایک کل ہند معیار قبولیت عِام حاصل کرتا گیا۔ اس کام میں نذیر احمد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی اور شرر کا بڑا ہاتھ رہا۔ یہی زمانہ سے جب امیر مینائی نے امیراللغات کے کچھ حصص مرتب کئے اور سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصیفہ مکمل

ہوئی (۱۸۹۲ء) فرہنگِ آصیفہ نے اُردو زبان کے معیارات کے تعین میں بڑی مدد کی، ہر چند داغؔ دہلوی اسے مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ بالآخر ۱۹۱۴ء میں مولوی عبدالحق نے اپنی مشہور اردو قواعد کا پہلا ایڈیشن شائع کر کے اس زبان کو ایک نیا قواعدی چوکھٹا عطا کیا۔

لفظیات کے نقطۂ نظر سے اردو میں بیسویں صدی کے ربع اوّل میں بہت توسیع ہوئی ہے۔ ابوالکلام اور اقبالؔ نے اس کا دامن عربی فارسی کی جانب کھینچا تو پریم چند جیسے ادیبوں نے اس کے ڈانڈے ہندی سے ملادیئے۔ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ نے اصطلاحاتِ علمیہ کے ذریعہ عربی زبان کا دہانہ اس میں کھول دیا اور اسے اس لائق بنادیا کہ یہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنائی جاسکے۔

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو اردو کے سر پر آرے چل گئے۔ مثلِ دکن، وطن سے دُور ایک بار پھر اس کو اپنا گھر بسانا پڑا۔

ع آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

○○○

چوتھا باب

اُردو کی ابتدا: لسانی نظریات

اُردو اور برج بھاشا

ہمارے یہاں لسانی تحقیق کے مردِ میدان آزادہیں جنھوں نے سب سے پہلے آبِ حیات میں اردو زبان کی تاریخ کو سلسلہ وار بیان کرنے کی کوشش کی ہے ۔ آزادشمالی ہند کی بولیوں کے باریک اختلافات سے ناواقف تھے ۔ اس لیے انھوں نے اردو کا ماخذ اپنے پیش روؤں چرنجی لال وغیرہ کی طرح برج بھاشا کو بتایا ۔ آبِ حیات کا پہلا جملہ یہ ہے ۔

"اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے "۔ برج بھاشا جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے شورسینی اَپْ بھرنش کی سّچی جانشین ہے۔ لیکن وہ کھڑی بولی کی ماں نہیں بہن ہے ۔ زبان کے معنوں میں لفظ برج (سنسکرت :درِج = جانوروں کا باڑا یا چراگاہ) بہت بعد کو استعمال ہوا ہے ۔ بقول ڈاکٹر دھیریندر ورما سب سے پہلے بھکاری داس نے "کاویہ نرنیئے " (سمبت ۱۸۰۳) میں استعمال کیا ہے ۔

اردو کا ڈھانچہ برج بھاشا پر تیار نہیں کیا گیا ہے، قدیم اردو کھڑی بولی اور جمنا پار کی ہریانوی بولی سے قریب تر ہے ۔ جدید اردو اپنے صرف و نحو کے اعتبار سے مراد آباد اور رام پور کے اضلا ع کی بولی سے قریب تر ہے۔ برج بھاشا نے بعد کو اردو معیاری لب و لہجہ متعین کرنے میں مدد ضروری دی ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سکندر لودھی کے عہد سے لے کر شاہ جہاں کے زمانہ (۱۶۴۸ء) تک آگرہ ہندوستان کا پایہ تخت رہا ہے ۔

(۱)اردو اور برج بھاشا (جدید دونوں میں) بعض صوتی اختلافات پا ئے جا تے ہیں ۔ مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کو دو گرہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔

(الف) (اُویااَو)والی بولیاں = برج بھاشا ، قنوجی اور بندیلی

(ب) (اَ) والی بولیاں = کھڑی بولی اور ہریانی ۔

برج بھاشا میں اسی لیئے اسماء ، افعال اور اسمائے صفت کا اختتام عموماً(او) پر ہوتا ہے ۔ مثلاً اَپَنو (اپنا)

چَلیو (چلا) گھورو (گھوڑا) ۔ برو(بڑا)

(۲)مغربی ہندی کی نمبر(ب)بولیاں (اِے)اور(اُو) حروفِ علّت کو ترجیح دی جاتی ہیں ۔ برج بھاشا میں (اَے) اور(اَو) آتے ہیں ۔ جدید اردو کا معیاری لہجہ برج بھاشا کا تبتع کرتا ہے ۔ مثلاً کھڑی بولی (دیہات) پیسہ ۔ برج بھاشا اور اردو: پَیسہ ۔ اسی طرح ہے اور ہے مِیں (واحد متکلم) اور میں ۔

(۳) ہریانوی کھڑی بولی اور پنجابی میں (ڑ) اور (ڑھ) آوازوں پر (ڈ) اور (ڈھ) آوازوں کو ترجیح دی جاتی ہے ۔ پنجابی میں (ڑھ) کی آواز معدوم ہے۔ قدیم اردو اور دکنی اس اعتبار سے ہریانوی کی پیروی کرتی ہیں۔

آج بھی ہریانہ اور کھڑی بولی کے علاقوں میں گڈّی (سہارن پور) (بڈا) (کرنال) چھاڈ (ضلع دہلی) چڈھنا (ضلع دہلی) بولے جاتے ہیں۔ (ڈ)اور (ڈھ) آوازوں کے متعلق یہ حکم لگانا کہ یہ پنجابی سے لی گئی ہیں ، ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے ارتقا سے متعلق ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے ۔(ڑ)اور (ڑھ) کی آوازیں دراصل (ڈ)اور (ڈھ)کی آوازوںہی کی ارتقائی شکلیں ہیں۔ یہ ارتقاءعہد پراکرت میں ہوا ہے۔یہ آوازیں جب کسی لفظ کے اندر واقع ہوتی ہیں تو عام طور سے (ڑ) اور (ڑھ) میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ دکنی کے مذکورہ بالا الفاظ (بڈا ۔ چڈھنا وغیرہ) میں اسی پراکرتی رجحان سے انحراف ملتا ہے جو موجودہ پنجابی، ہریانوی اور کھڑی بولی تک میں پایا جاتا ہے۔ لیکن لسانی ارتقا کے اصولوں کے زور پر رفتہ رفتہ (ڑ) اور (ڑھ) کی آوازیں زیادہ شستہ خیال کی جانے لگیں۔ اسی لیے برج بھاشا کی طرح جدید اردو اور ہندی میں (ڈاور ڈھ) جب لفظ کے درمیان آتے ہیں تو عام طور سے (ڑاور ڑھ) میں تبدیل ہوجاتے ہیں ۔ مثلاً

اردواور برج	دکنی	ہریانوی اور کھڑی بولی
بڑھانا	بڈھانا(قطب مشتری)	بڈھانا
بڑائی	بڈائی	بڈائی (نمونہ محبوب عالم، پنجاب میں اردو)
پڑھنا	پڈھنا	پڈھنا (نمونہ محبوب عالم، پنجاب میں اردو)
چڑھنا	چڈھنا	چڈھنا(نمونہ محبوب عالم، پنجاب میں اردو)
چھوڑا		چھاڈا(چوم چھاڈا بھاری پتھر محاورہ زٹلی ازپنجاب میں اردو ص ۱۹۸)

لیکن دکنی میں پڑنا (پڑھنا) اور چڑنا (چڑھنا) (دیکھئیے ۔ فرہنگ شہ پارے) بھی آیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ دکنی میں (ڑھ) کی آواز پنجابی کی طرح کالعدم نہیں بلکہ ہریانوی زبان کے مانند گاہ گاہ پائی جاتی ہے ۔

'اس کے بعد پروفیسر شیرانی کے اس قسم کی لسانی نوٹ کس قدر بے سروپا معلوم ہوتے ہیں کہ :۔

"اردو کی " ڑ " ہریانوی میں " " ڈ" سے بدل جاتی ہے۔ (پنجاب میں اردو)

جدید اردو میں (ڈ)، (ڈھ)، (ڈمشّدد) اورنڈ(غنہ کے ساتھ) اور (ڑ)، (ڑھ) ڑ(مشّدد) اور نڑ(غنہ کے ساتھ) کا استعمال حسب ذیل جدول کے مطابق پایا جاتا ہے ۔

	لفظ کی ابتدا	لفظ کے درمیان	لفظ کے آخر میں
ڈ	صحیح	X	X
ڈھ	صحیح	X	X
ڈّ (مشّدد)	X	صحیح	X
نڈ(غنہ کے ساتھ)	X	صحیح	صحیح
ڑ	X	صحیح	صحیح
ڑھ	X	صحیح	صحیح
ڑّ(مشدّد)	X	X	X
نڑ(غنہ کے ساتھ)	X	X	صحیح

اشارے : (۱)(ڈ) صرف لفظوں کے شروع میں ملتا ہے اور (ڑ) سے کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا ۔

(۲) لفظ کے درمیان میں (ڈ) صرف "گڈریا" میں پایا جاتا ہے۔ بولیوں میں یہ بھی بدل کر "گڑریا" ہوجاتا ہے۔

(۳)لفظ کے درمیان میں (ڈ) صرف مرکب الفاظ میں ملتا ہے ۔ مثلاً نِڈر (نِ+ڈر) سڈول ، ڈانواڈول ۔ ڈبڈبائی (ڈب +ڈبائی)

(۴) لفظ کے آخر میں (ڈ) ہمیشہ غنہ کے ساتھ آتا ہے ۔ مثلاً رانڈ ۔سانڈ، البتہ انگریزی کے مستعار الفاظ (مثلاً روڈ، بورڈ ، کارڈوغیرہ) اس قاعدے سے مستثنٰی ہیں ۔ ان کے علاوہ پراکرت کے کچھ ایسے الفاظ بھی ہیں جو درحقیقت مشدّد "ڈ" رکھتے ہیں، لیکن جو اردو والے غیر مشدّد طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کھڈ، اجڈ، لاڈ (جو لاڑبھی بولا جاتا ہے)

(۵)ڈھ صرف الفاظ کے شرروع میں ملتا ہے ۔ درمیان میں یہ ہمیشہ ڈ کے ساتھ مشّدد آتا ہے ، مثلاًبُڈّھا (بُ +ڈ+ ڈھ +ا) لفظ کے آخر میں یہ (ڑھ) بن جاتا ہے (علی گڈھ کی بہ نسبت علی گڑھ فصیح تر ہے)

(٦) ۔(ڑ) اور (ڑڑھ) الفاظ کے شروع میں کبھی نہیں آتے ۔

(۷)مشدّد (ڈ) یا (ڈھ)کا فصیح تر تلفظ (ڑ) یا (ڑ ھ) کی شکل میں اکثر کیا جاتا ہے۔

بڈّھا > بوڑھا

گڈّھا > گڑھا

ٹھڈّی > ٹھوڑی

ان آوازوں کے لحاظ سے اردو برج بھاشا اور اور ہریانوی کا نہایت لطیف امتزا ج پیش کرتی ہے اور اس کا یہ رجحان ابتدا سے رہا ہے ۔

اُردو اور برج کے صرفی و نحوی اختلافات

ضمائر:۔

(ا)متکلم واحد بھاشامیں(مَیں) اور (ہوں) دونوں مستعمل ہیں ۔ جدید ادبیات میں دونوں کا استعمال قریب قریب برابر ملتا ہے ۔۔۔۔۔ قدیم میں " ہوں " زیادہ مستعمل تھا اردو میں معدوم ہے ۔ البتّہ دکنی میں قلی قطب شاہ کی " ریختی " میں مل جاتا ہے

ص ۶۲ پیارے نہ کر کھیچ ، ہَوں تو پہ واری

ص ۶۳ ہَوں تِل تِل تمن پر تھے ہو پیاری

ص ۶۳ کہ تن من جو بن آپ ہوں تو پہ واری

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ کلیات میں " ہَوں " صرف ریختی میں آیا ہے ۔ اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ یہ اس وقت تک متروک ہوچکا تھا لیکن چونکہ زنان خانے کی زبان بہت آہستہ بدلتی ہے اس لیے عورتوں کی زبان پر اس وقت تک جاری تھا ۔ اس شعر میں " توپہ" (تجھ پہ) بھی قابل ذکر ہے جو خالص برج ہے۔

"ہوں" پنجابی قدیم وجدید میں بھی ملتا ہے ۔لیکن "مَیں" کے مقابلہ میں کم ترگجراتی میں یہ "ہُوں" ہے

(۲)برج بھاشا کا " مو" اور " موٴہیں" دکنی کا " مجھ "اور اردو کا " مجھے " ہے لیکن قلی قطب شاہ کی ریختوں میں مو (میرا) اور مجھ کے معنوں میں بھی آیا ہے ۔ (دیکھئے ریختی ص ۶۱ ، ۶۲ ۔ کلیات)

(۳) مخاطب واحد اور جمع : برج بھاشا میں ۔" تو " اور " توں " کے ساتھ ۔ " تیں " اور " تَیں" بھی مستعمل ہیں جو جدید اردو میں نہیں ملتے ۔ لیکن " عاشورنامہ" میں موجود ہیں۔ برج بھاشا کے ضمائر مخاطب کے اندر مذکر و مونث کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے ۔

"تیرا " اور "تمھارا" (جو برج بھاشا میں "تیرو" اور تمھارو " ہوجاتے ہیں) کے علاوہ ایک اور شکل " تہارو" بھی ملتی ہے جو راجستھانی کے زیر اثر برج نے قبول کی ہے ۔ دکنی اور اردو میں یہ نہیں ملتی ۔ البتّہ دہلی کی موجودہ زبان کے محاورات میں مل جاتی ہے ۔

" جیسے ۔" تہارا مال سو مہا را مال سو ہیں ہیں "

یعنی اپنے موقع پر" ہیں ہیں "کرکے ٹال جانا ۔

ضمائر کی مزید شکلیں جو برج بھاشا سے مخصوص ہیں حسبِ ذیل ہیں ۔ تاہیں ۔ توہی ۔ توہے ۔ تیراؤں ،

تمہوں، تمہائیں ۔ موہی، موئے، میراؤ، ہماؤں، ہمن (قدیم اردو میں ملتا ہے) ہمائیں، وہ (وہ کے لئے "وہ" دکنی میں ملتا ہے) وِس ۔ وا، واہی، وائے، وِے (قدیم (اردو دکنی) میں جمع کے طور پر آیا ہے اُنی ۔ اُن ۔ اُنہاؤن، وِنی، وِن (دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بھی اِن کے لئے آتا ہے) اِنہائیں، وِنہائیں۔

جوں ، جاسو، تاسو، جنھائیں، تنھِائیں ۔ کُو (کون) کاہی

(۴) برج بھاشا کے صوتی اصولوں کا ضمائر پر بھی اثر پڑا ہے مثلاً :۔

اردو :	تمہیں	برج	تمہو
"	ہمارا	"	ہمارو
"	میرا	"	میرو

(۵) اسماء کی جمع بنانے کے لئے اردو میں "وں" اور پنجابی میں "اں" لگاتے ہیں ۔ برج بھاشا میں صرف "ن" کا اضافہ کرتے ہیں ۔

اردو: گھوڑوں ۔ پنجابی: گھووڑاں ۔ دکنی : گھوڑاں

ہریانوی: گھوڑاں برج بھاشا: گھورنّ

برج بھاشا کے (ن) جمع کی مثالیں البتہ دکنی کے" نوسرہار" میں مل جاتی ہیں ۔

ع ڈھونڈن لاگے کدھر سے ٹھار (۵٦۷)

ع رُووَن لاگا کس کس دھات (۱۳۱۹)

دکنی اردو کی جمع کا عام طریقہ "اں" کا ہے

افعال :

(۱) اردو میں مادّہ کے اندر "تا" کا اضافہ کرکے فعل مضارع بنایا جاتا ہے ۔ برج بھاشا میں "ت" لگایا جاتا ہے ۔ مثلاً کرت، پرت ۔ جات وغیرہ اس کے علاوہ مذکر کے لئے "تو" اور مونث کے لئے "اتی" کی شکلیں بھی لائی جاتی ہیں "جاتو" ہے، نہارتی (دیکھتی) ہے ۔

افضل کے" بارہ ماسہ" اور شیخ محبوب عالم کی ہریانی تالیفات میں مضارع کی یہ شکلیں عام طور سے ملتی ہیں ۔ لیکن دکنی میں نہیں مِلتیں ۔

(۲) اپنے (اَو) والے صوتی اصول کو برقرار رکھتے ہوئے برج بھاشا میں ماضی "مارا" یا ماریا" نہیں ہوتا بلکہ "ماریو" یا "مارو" ہوتا ہے ۔ جیسا کہ بعض نے اشارہ کیا ہے ۔ ماریا، یا مارو ایک دوسرے سے ماخوذ نہیں ۔

(۳) مستقبل، برج بھاشا میں (گ) یا (ہ) کی مختلف شکلوں سے بنتا ہے جن میں (گو) کی بہ نسبت (ہ)

کی شکل زیادہ عام ہے ۔ مثالیں ۔

چلوں گی چلی ہَوں

نوٹ :۔ عام طور سے (ہ) پوری ادا نہیں کی جاتی اس لیے چلی ہوں محض "چلیؤں بن جاتا ہے ۔

شیرانی کا یہ خیال صحیح نہیں کہ "گو" کی علامتِ مستقبل برج بھاشا نے پنجابی یا اردو سے لی ہے۔ برج بھاشا کے قدیم ترین نمونوں میں ہمیں" گو"کی شکلیں ملتی ہیں ۔ ہَوں چلوں گا (صفحہ ۱۶ / ۷)دیوں گو ۲ / ۶) راکھیں گے (صفحہ ۲ / ۱۴)، ہوئے گو (صفحہ ۲۴ / ۷) (ازچوراسی ویشنوں کی وارتا: گوگل ناتھ : الہ آباد (۱۹۲۶ء)

(ہ) سے بنا ہوا مستقبل قدیم و جدید اُردو میں کہیں نظر نہیں آتا ۔

(۴)برج بھاشا کا مصدر بھی اس سے مختلف ہے ۔ برج میں مصدر" بو" "وو" یا "نو" کے اضا فے سے بنتا ہے ۔ ہو بوٗ۔ بوجھبوٗ۔ چلنوٗ وغیرہ ۔

(۵) افعال امدادی میں دونوں زبانوں کا اختلاف اور نمایاں ہوجاتا ہے ۔ زمانۂ حال میں (ہ) کی مختلف شکلیں لگائی جاتی ہیں جو دونوں زبانوں میں مشترک ہیں ۔صرف " ہوں "کا تلفظ برج میں " ہؤں " ہوجاتا ہے ۔لیکن زمانۂ ماضی میں فعل امدادی کی شکل بالکل مختلف ہے ۔ اردو میں " تھا "کی مختلف شکلیں مستعمل ہیں ۔ برج بھاشا میں" ہو " اور "ہتو"کی مختلف شکلیں آتی ہیں جو تاریخ اردو میں کسی عہد میں مستعمل نہیں ہوئیں ۔ اسی وجہ سے برج بھاشا کے حال اور مستقبل میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے ۔

حروف :

(۱) حروف میں کو ۔ سے ۔ میں اوپردی ہوئی صوتی خصوصیات کے تحت کَو۔ سَے ۔ مَیں ۔بن جاتے ہیں ۔ ہریانوی اور پنجابی میں" کو" کی بجائے " نوں " ملتا ہے ۔ کھری بولی کے بعض اضلا ع ۔ میرٹھ ،سہارنپور ۔ وغیرہ میں بھی یہ سننے میں آتا ہے ۔ لیکن دکنی اور برج میں "کو" ہی مختلف تلفظ (کُو ۔ کَو، کوں) کے ساتھ لکھا جاتا ہے ۔ برج بھاشا کے قدیم ادبی نمونوں میں ، میں ، سوں ، نیں ، پے اور ماجھ ۔ پاچھیں ۔ (پیچھے) سنگ ،سَم (طرح) بھی ملتے ہیں جو قدیم اردو میں بھی مستعمل تھے۔ لیکن بعض حروف ایسے بھی ہیں جنھیں اردو نے کبھی منہ نہیں لگایا۔ مثلاً نکٹ (نزدیک) سَہِت(ساتھ) ہت(لیے) لَوں (دکنی میں لگ ملتا ہے)۔ یہ تمام حروف برج بھاشا میں قدیم زمانے سے مستعمل تھے ۔

لیکن اُردو اور برج کے مذکورہ بالا اختلافات کے باوجود سکندر لودھی کے زمانے سے لے کر شاہ جہاں کی تبدیلی دارالسلطنت(۱۶۴۸ء)تک اردو کے ارتقا میں اس کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اردو زبان کی تاریخ میں دہلی سے آگرہ کو دارالسلطنت کے انتقال اور اس کے اثرات کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا ہے ۔ حالانکہ ہمارے خیال میں قدیم

اردو کی اکثر گتھیاں اس تاریخی حقیقت کو سامنے رکھنے سے کھل جائیں گی ۔ تقریباً دو سو سال تک ہندوستان کا دارالسطنت برج بھاشا کے علاقہ میں آگرہ رہا ہے تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے یہ دوسو سال ازمنہ وسطی کی تاریخ میں اہم ترین ہیں۔ چنانچہ اردو ادبیات میں اس کی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں کہ معیار زبان کے لئے دارالسلطنت کی زبان کی طرف لوگ رجوع کرتے تھے ۔ یہ کبھی برج اور کبھی "گوالیاری" کے نام سے سامنے آتی ہے ۔ اس کی قدیم ترین مثال "گوالیر کے چاتران" کی زبان ہے جس کے دوہے اور کہاوتیں ملاّوجہی کی سب رس تک (۱۶۳۵ھ) میں مل جاتے ہیں ۔ دکن کے مصنفین بھی اس کے دائرہ اثر سے باہر نہیں تھے ۔ اگر شیرانی کی تحقیقات کے مطابق خالق باری ۱۶۲۱ء کو عہدِ جہاں گیری کے ایک بزرگ ضیاء الدین خسرو کی تصنیف مان لیا جائے تو وجہی سے قبل برج کے بارے میں یہ عبارت ملتی ہے۔

" خیر خواہ شعرائے شیریں گو ضیاء الدین خسرو باستدعائے
عزیز الفواد بابا اسحاق قناّدچند الفاظ عربی وپارسی رابزبانِ ہندی
گوالیاری کہ ارباب روز مرہ راناگزیراست ترجمہ نمودہ و دربحور
مختلفہ بطریق ریختہ نظم آوردہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

اقتباس بالا سے ظاہر ہے کہ عہدِ جہاں گیری میں " ہندی گوالیاری " " ارباب روز مرہ" کے لئے ناگزیر تھی ۔ یہ " ہندی گوالیاری" اکبر، جہاں گیر، شاہ جہاں اور عالمگیر کے عہد تک مستند زبان سمجھی جاتی تھی ۔ شاہ جہاں کا دہلی کو دوبارہ پایۂ تخت بنانے سے کھڑی بولی یا زبان دہلوی کی حیات ثانیہ شروع ہوجاتی ہے ۔ زبان دہلی کے نشاۃ الثانیہ میں تقریباً نصف صدی لگ گئی اور محمد شاہ کے عہد میں برج پر اس کا محاورہ اور تلفظ غالب آگیا ۔ شاہجہاں کے عہد کے ایک مصنفِ موسیقی ابنِ سید علی مرزا بیگ اپنے رِسالہ " زمزمۂ وحدت" میں " بزبان فصیح و بلیغ گوالیار" کا ذکر کرتے ہیں ۔

ع درکام خلق وصف وبیان ازلب تو ہست
شیریں و خوش لساں چو زبانِ گوالیار

عالمگیر کے زمانے میں " زبان گوالیاری" سے " بنوالی المتخلص بہ ولّی بہ امداد بھوانی داس" "گوالیاری سے فارسی میں ایک کتاب "گلزار حال" ترجمہ کرتے ہیں ۔

اس سے قبل مرزا خاں کی تحفۂ الہند (۱۶۷۵ء)کا ذکر ہوچکا ہے جو شاہزادوں کی تعلیم کے سلسے میں برج بھاشا کی پہلی قواعد فارسی میں لکھی گئی ہے ۔

خان آرزو " نوادرالالفاظ " میں زبان گوالیار(یا برج) کو اکثر جگہ " افصح زبان ہائے ہند " لکھتے ہیں ۔ انیسویں صدی کے اواخر میں چرنجی لال اور کئی دوسرے مصنفین اردو کا ماخذ برج ہی کو بتاتے ہیں ۔ چنانچہ

اسی خیال پر محمد حسین آزادؔ نے آبِ حیات میں یہ فقرہ لکھا ہوگا۔

"اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے"

ہمارا خیال ہے کہ خسرو " زبان دہلی " کے ارتقا کا شمالی ہند میں یک لخت رک جانے کا سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ پایۂ تخت دہلی سے منتقل ہوکر آگرہ چلا گیا تھا۔ اورنگ زیب کے زمانہ سے (بالخصوص جب وہ اپنی فتوحات دکن کے سلسلے میں اورنگ آبادی اردو سے دوچار ہوتا ہے) زبان دہلوی کا باقاعدہ ارتقا پھر شروع ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ ادبیات کی گوں کی سمجھی جانے لگی۔ اس وقت فارسی اور برج دونوں کا افسوں ٹوٹ چکا تھا اور دہلوی زبان پر پنجابی کے اثرات زائل ہوکر اس کی اپنی مستقل شکل متعین ہوچکی تھی۔ گو اُردو کے پہلے بڑے ماہر لسانیات خاں آرزوؔ "زبان اُردو" یا "زبان اُردو شاہی" کے مقابلے میں سند "گوالیاری" سے لینا پسند کرتے تھے۔ لیکن خاں آرزوؔ آخری شاعر اورعالم تھے جنھوں نے گوالیاری کو مستند جانا ہے۔ محمد شاہ کے دور سے دہلوی سماج کے اعلیٰ طبقات کا محاورہ افصح اور بلیغ سمجھاجانے لگا۔ خاں آرزوؔکی گوالیاری پسندی کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے پیشِ نظر عبدالواسعؔ کی غرائب اللغات ہندی تھی۔ عبدالواسع کا وطن علاقہ ہریانہ میں " ہانسی" تھا اور چونکہ ان کے پیشِ نظر عوامی محاورہ تھا، اس لیے انھوں نے ثقات کے نقطۂ نظر سے غلط لکھا ہے۔ ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ خاں آرزوؔ کا آگرہ اور گوالیار سے گہرا تعلق تھا اور ظاہر ہے کہ مادری زبان کی حیثیت سے انھوں نے برج ہی کا محاورہ سیکھا ہوگا۔ لیکن چونکہ خاں آرزوؔ نے اپنی نوادرالالفاظ دہلی میں بیٹھ کر لکھی تھی اس لیے " الفاظ" کی بہت سی مکتوبی اور ملفوظی شکلیں وہی ہیں جو غرائب اللغات میں موجود ہیں۔ اگرچہ خان آرزو ہانسوی کے بہت سے الفاظ ٹکسال باہر قرار دیتے ہیں مگر بہت سے ایسے الفاظ کو قبول بھی کرلیتے ہیں جنھیں بعد کے مصلحین زبان اردو نے مکروہ اور گنوارو قرار دے کرزبان سے خارج کردیا۔

اُردو اور پنجاب

پروفیسر شیرانی نے اپنی تصنیف " پنجاب میں اردو" میں بعض مفروضات کی بناء پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کھڑی اور ہریانوی پنجابی مسلمانو ں کے داخلۂ دہلی کے بعد ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ اس کا تاریخی جائزہ پچھلے صفحات میں لیا جاچکا ہے۔ پروفیسر مرحوم کے نظریہ کا دوسرا پہلو خالص لسانیاتی ہے۔ قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی صرف و نحو کی مشترک خصوصیات کا ذکر کر کے انھوں نے بعض اہم لسانی نتائج اخذ کیے ہیں۔ لسانی استدلال کے اس طریق پر ذیل میں تنقید کی جائے گی۔

پروفیسر شیرانی نے " پنجاب میں اردو" لکھتے وقت اس لسانی حقیقت کو بالکل نظر انداز کردیا ہے کہ راجستھانی اور گجراتی کی طرح پنجابی کا تعلق بھی کسی زمانے میں زبانوں کی بیرونی شاخ سے تھا جس کے اثرات

کی نشاندہی آج بھی کی جاسکتی ہے۔ بعد کو (شاید شورسَینی اَپْ بھرنش کے عہدِ عروج میں) اس پر اندرونی زبان ، مدھیہ دیش کی زبان کا ، جس کی نمائندہ بولیاں برج اور کھڑی ہیں، اس قدر گہرا اثر پڑا کہ اس کی صورت بدل گئی ۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ مغربی اور مشرقی پنجابی کے درمیان خطِ فاصل قائم کرنا دشوار ہے۔ یہ دونوں زبانیں اس غیر محسوس طریقہ پر گھل مِل جاتی ہیں کہ گریرسنؔ کے خیال میں کسی زمانے میں سارے پنجاب پر لہندا چھائی ہوئی تھی ، جسے بعد کو دو آبہ کی بولیوں نے پیچھے ڈھکیلنا شروع کیا اور رچنا دو آب تک ہٹادیا ۔ دو آبہ کی زبان کے نشانات سندھ ساگردوآب تک کی لہندا میں پائے جاتے ہیں۔ جوں جوں مشرق کی سمت آئیے اس کا رنگ اور گہرا ہوجاتا ہے۔ اسی لیئے راجستھانی اور گجراتی کی طرح پنجابی کو " ملواں " زبانوں کی صف میں جگہ دی گئی ہے۔

ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کی پیدائش کے سلسلے میں ہر قسم کا مطالعہ اور تنقید بے سود ثابت ہوگی جب تک کہ :۔

(الف) ہند آریائی زبان کے ارتقا کی عہدِ قدیم سے نشان دہی نہ کی جائے بالخصوص جب تک کہ عہدِاَپ ْبھرنش کی ادبیات کا لسانی جائزہ نہ لیا جائے۔

(ب) جب تک کہ تقابلی مطالعہ تمام ہمسایہ بولیوں کے ساتھ نہ کیا جائے ۔ شیرانی نے اپنی تصنیف میں نمبر (الف) کو نظر انداز کرکے اپنے لسانی نظریہ کو بے بنیاد کردیا ہے۔ نمبر (ب) کا خیال نہ رکھنی کی وجہ سے وہ بعض یکطرفہ لسانی نتائج مرتب کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ہر دو ہمسایہ بولیوں میں کچھ نہ کچھ مشترک خصوصیات ضرور ہوتی ہیں، چنانچہ اردو اگر ایک طرف اپنی قواعد کے اعتبار سے پنجابی سے ملتی جلتی ہے تو دوسرے طرف ہریانوی سے بھی مماثلت رکھتی ہے آج کل کی معیاری اردو رام پور اور مراد آباد کے اضلاع کی بولی سے قریب تر ہے ۔ لیکن اپنے ارتقا کے ابتدائی مدارج میں یہ دو آبہ کی کھڑی اور جمنا پار کی ہریانوی بولی سے زیادہ قریب تھی ۔ قدیم دکنی میں بعض اثرات پنجابی کے بھی جھلکتے ہیں۔ اس لئے تقابلی مطالعہ کا میدان ذرا وسیع ہونا چاہیئے اور جہاں تک ہوسکے پنجابی، اردو، ہریانوی اور برج بھاشا کی ادبیات کے قدیم ترین نمونوں پر نظر رکھنی چاہیے ۔

(۱)شیرانی نے پنجابی اور اردو کی ایک اہم مشترک خصوصیت علامتِ مصدر " نا " بتائی ہے ۔ اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ " نا " کہ علامت مصدر پنجابی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قدیم زمانے (دیکھئے نمونہ محبوب عالم، پنجاب میں اردو) سے ہریانوی میں" ن" کے ساتھ " نا " بھی ملتا ہے ۔ علاوہ ازیں خود پنجابی میں " نا" کے ساتھ ساتھ "ن" بھی بطور علامت مصدرملتا ہے۔ مثلاً " گھالنا " اور " گھالن " (بھیجنا) جہاں تک اختتام پر نون غنہ " ناں "کا تعلق ہے یہ بھی پنجابی سے مخصوص نہیں ۔ دہلی کے آس پاس کی بولیوں میں قدیم زمانے سے یہ خصوصیت ملتی ہے دہلی والے آج بھی دہی کو دہیں (خالق باری دہیں، سب رس =دہیں) باراں ،

ستراں وغیرہ بولتے ہیں ۔ نون غنہ کا سلسلہ اَپْ بھرنش سے ملایا جاسکتا ہے۔ جس میں حروفِ علّت عام طور سے انفی ہوجا تے ہیں ۔ دکنی چوں کہ اکثر اَپْ بھرنشی خصوصیات کی حامل ہے اس لیئے اس میں اس کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں مثلاً کونچ ،سنْتاتا(ستانا) آدمیں (آدمی)۔ برسانت، دکھلائینگا، جائینگا ان کے علاوہ سیں ، کوں ، توں وغیرہ تو ہر صفحہ پر مل جائیں گے ۔ غنہ آواز کی پیدائش جدید آریائی زبانوں کی مشترک عالم گیرخصوصیت ہے ۔ توں(تو) پنجابی سے لے کر دکنی ، ہریانوی ، کھڑی بولی، راجستھانی اور برج بھاشا تک میں یکساں طور پر قدیم زمانے سے مستعمل ہے ۔ خیر المجالس اور " مکتوبات قدسیہ" کے ہندی فقروں میں بیک وقت (تو) اور(توں) ملتا ہے۔

(۲) اردو(اَ) گروہ سے تعلق رکھنے والی زبان ہے یعنی اس میں اعلام و اسماء اور اسما ئے صفات الف پر ختم ہوتے ہیں۔ جب کہ برج بھاشا بندیلی اور قنوجی میں " اَو" پر ۔ اس سلسلہ میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اردو پنجابی سے متاثر ہے جس کی نمایاں خصوصیت (اَ) ہے ۔ یہاں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ (اَ)اور (اَو) دونوں شکلیں ازمنہ وسطیٰ کی پراکرتوں سے ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ مغربی ہندی کی تین بولیوں نے (اَو) کی شکل کو اپنایا لیکن باقی ماندہ دو بولیوں (کھڑی اور ہریانی) میں(اَ)ہی کی شکل ملتی ہے ۔ یہ امر اب مسلمہ ہے کہ قدیم دکنی شمالی ہند کی کسی ایسی بولی پر مبنی ہے جس کی بنیاد (اَ) پر ہے یعنی اس میں اسماء، اسما ئے صفات اور اعلام کا اختتام " الف" پر ہوتا ہے۔ چنانچہ دکنی ادبیات میں (اَو) کی شکل کہیں نہیں ملتی۔ اس کی مزید توضیح اردو کے ایک دیہاتی نام یعنی کھڑی بولی سے ہوجاتی ہے ۔

لفظ کھڑی بولی سے متعلق اب تک عجیب و غریب قیاس آریائیاں ہوتی آئی ہیں ۔

(۱) پنڈت چندردھرشرما گلیری کا خیال تھا کہ " بدیسی مسلمانوں نے آگرہ، دلی، سہارن پور اور میرٹھ کی کسی پڑی بھاشاکو کھڑی بنا کر اپنے لشکر اور سما ج کے قابل بنادیا ، "

(۲) کھڑی بولی کی تشریح میں اس قسم کی غلط فہمی مولوی عبدالحق کو بھی ہوئی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں " کھڑی بولی" کے معنیٰ عام طور سے ہندوستان میں گنواری بولی کے ہیں جسے ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے ۔ وہ نہ کوئی خاص زبان ہے اور نہ زبان کی کوئی شا خ ۔"

دراصل کھڑی بولی کے تصوّر کے لئے برج بھاشا کا پس منظر ضروری ہے ایک کا تعلق (اَ)گروہ کی زبانوں سے ہے اوردوسری کا (اَو)گروہ والیوں سے۔ اگر یہ کہا جائے کہ برج بھاشا کے مقابلے میں یہ بولی کھڑی لگتی ہے تو بات ذرا عقلیات کے دائرہ سے نکل کرحسّیات میں آجاتی ہے لیکن اس کا عقلی اور لسانی جو ازہم بیان کرچکے ہیں۔ یہی وجہ ہےکہ بندیل کھنڈمیں ا سے"ٹھار" بولی اورمارواڑ میں ا سے "ٹھاٹھ" بولی کہتے ہیں ۔"ٹھار"اور"ٹھاٹھ" دونوں کا مفہوم"کھڑا"ہوتا ہے۔ زبان کا یہی کھڑا لہجہ پوربی اور برج بھاشا کے مقابلے میں معیاری سمجھا جاتا ہے

یہی کھڑا لہجہ ہریانے کے علاقے اور جاٹوں کی زبان میں " اکھّڑ" بن جاتا ہے جو درمیانی حروفِ عِلّت بلا استثناء دبادیتے ہیں ۔ گڈّی ، بدّل ، لُٹّا ، رُتّی وغیرہ ۔ قدیم دکنی میں یہ بھی رجحان پایا جاتا ہے ۔

اسماء وصفات کے سلسلے میں ذیل کی مشترک خصوصیات پر پروفیسر شیرانی نے زور دیا ہے ۔

(۳) اسماء وصفات تذکیر و تانیث اور جمع واحد میں اپنے موصوف کی حالت کے مطابق ہوتے ہیں ۔

اردو :۔ بڑا لڑکا ۔ بڑے لڑکے ۔ چھوٹی لڑکی ۔ چھوٹی لڑکیاں ۔

پنجابی :۔ وَڈّا مُنڈا ۔ وَڈّے مُنڈے ۔ نکّی کڑی ۔ نکّیاں کڑیاں ۔

میؔرو سوداؔ سے پہلے کی اُردو اور دکنی میں چھوٹی لڑکیاں کی بجائے " چھوٹیاں لڑکیاں " ہی کہا جاتا ہے ۔ شیرانی کے خیال میں یہ بے ضابطگی میؔرو سوداؔ کے عہد سے شروع ہوتی ہے ۔

(۴) خبر تذکیر و تانیث، واحد ، جمع میں اپنے متبدا کے موافق آتی ہے ۔

جدید اردو:	یہ بات بھلی نہیں	یہ باتیں بھلی نہیں
پنجابی :	ایہ گل چنگی نہئں	ایہ گلاں چنگیاں نہئں
قدیم اردودکنی :	- -	باتاں بھلیاں نہیں

سوداؔ ۔ ع نہ میں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں ۔

(۵) فعل تذکیر و تانیث اور واحد جمع میں اپنے فعل کے مطابق آتا ہے ۔

اردو :	عورت آئی	عورتیں آئیں
پنجابی :	بڈھی آئی	بڈھیاں آئیاں
قدیم اردو (دکنی)	- -	عورتاں آئیاں

حاتم لا جب سے تری ادائیں عالم کو بھائیاں ہیں

تب سے جہاں میں تو نے دھومیں مچائیاں ہیں

سوداؔ ع ۔ یہ انکھیاں کیوں مرے جی کے گلے کا ہار ہو پڑیاں

(٦) اضافت بھی اپنے فاعل کی تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کے مطابق آتی ہے ۔

اردو : اس میں کوٹھریاں رنگ برنگی ہیں بعض چاندی کی - - - - - - وغیرہ

پنجابی : اوہ وے وِچ کوٹھریاں رنگ برنگیاں بعصنیاں چاندی دیاں - - - - ۔ وغیرہ

دکنی :اس میں کوٹھریاں رنگ برنگ کیاں، بعض چاندی کیاں۔۔۔۔۔۔ - - - - - - - - - ۔ وغیرہ ۔ (ہزار مسائل)

دکنی : یوں نود ہزار باتاں اللہ ہور محمدؐ کیاں - - - ۔ (معراج العاشقین)

مذکورہ بالا لسانی خصوصیات کے متعلق یہ کہنا کہ اردوئے قدیم یا دکنی نے پنجابی سے لی ہوں گی،

محض بے بنیاد قیاس آرائی ہوگی، یہی صرفی خصوصیات دہلی کے قرب وجوار کی بولیوں میں آج پائی جاتی ہے، انبالہ کی کھڑی بولی اور ہریانہ کے علاقوں کے قدیم ترین مصنفوں محمد افضل اور عبدی ،شیخ محبوب عالم ، ساکن جھجھر وغیرہ کے یہاں ملتی ہیں ۔ مثلاً دن کی جمع دناں ، کھیت کی جمع کھیتاں ، گھر کی جمع گھراں وغیرہ۔ آج بھی ہریانہ کے علاقہ میں بولی جاتی ہیں ۔ شیخ محبوب عالم کے محشرنامہ میں اسی نہج پر ٹکراں ۔ غریباں ، جھوٹاں ، اونٹاں وغیرہ ملتی ہیں ۔

لا لب پہ کلی کے مہر کرے اس لباں کا رنگ (حاتم)

اسی طرح سے آئیاں ، جائیاں وغیرہ ،حاتمؔ، میرؔاور سوداؔ سے لے کر لکھنؤ میں میرؔانیسؔ اور دہلی میں داغؔ تک نے باندھا ہے ۔ راقم السطور نے خود دہلی کی بڑھیوں کی زبان سے اس قسم کے صیغے سنے ہیں ۔ شاہی زمانہ تک لال قلعہ کی یہی زبان تھی ۔ اس کی لسانی وجہ ہمارے خیال میں یہ ہے کہ اس وقت تک جدید آریائی زبانوں میں " نے " علامت فاعلی کی شکل میں جڑ نہیں پکڑی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ اُردوئے قدیم میں " نے " کا جتنی بے ضابطگی کے ساتھ استعمال ملتا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی ۔ قدیم اُردو یا ہندی ادب میں " نے " علامتِ فاعلی کے طور پر استعمال ہونے لگا ہے ۔ افعال کا مفعول کی بجائے فاعل کے مطابق آنے کی یہی وجہ ہے ۔ دکنی میں دونوں صورتوں میں بہ کثرت ملتا ہے لیکن دکنی میں " نے " کے استعمال میں بے قاعدگی ملتی ہے ۔ اس میں یہ فاعل ، مفعول دونوں کے لیے آتا ہے جیسا کہ ہریانوی کا دستور ہے لیکن فاعلی علامت ہونے کی حالت میں اُردو کے برخلاف فعل اپنے فاعل کا تابع رہتا ہے ۔

(۱) فاعلی : (۱)۔ غمزے نے نظر کو اپنے گھر لے کر گیا

(سب رس ص ۹۰)

(۲) رقیب نے ، روسیاہ نے ، بے نصیب نے بولیا

(سب رس ص ۷۱)

(۳)مفعولی(۱) آدمی برا اچھے تو شراب نے کیا کرنا

(سب رس ص ۳۴)

(۲) بے نمک کھاتے آدمی نے کیا سواد پانا

(سب رس ص ۲۸)

میرؔو سوداؔ کے زمانہ تک اس کے استعمال میں قاعدہ کی پابندی نہیں برتی جاتی تھی ۔ ع ۔ گل کو محبوب مَیں قیاس کیا (میرؔ)۔ حاتم نے بعض اوقات " نے" فاعلی استعمال کی ہے ۔ لیکن ان کا عام رجحان یہی ہے کہ وہ اسے حذف کردیتے ہیں ۔ مثلاً ان کی یہ غزل جس کی ردیف ، ہم ، ہے (کیے ہیں ہم ، پئے ہیں ہم) میں " نے " فاعلی

نہیں ملتی ۔ مزید مثالیں " میں دیکھا" (انتخاب حاتم ص ۲) ہم سیرکو جو دیکھا " ایضاً ص ۴۱ ع ۔ رات ہم خواب میں اس زلف کو پیچاں دیکھا ۔(ایضاً ص ۲) لیکن " نے " فاعلی کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں ۔ ع کہ جیسا ہم نے کھینچا آن کر آزار دینا میں "(ایضاً ۲۹) مزید صفحہ ۲۹ " اور صفحہ ۳۵ پر ۔

آج بھی ہریانوی میں بحیثیت علامت فاعل اور مفعول ایک ہی جملہ میں اس طرح استعمال ہوتا ہے ۔

من نے صاحب نے ماریا = مجھے صاحب نے مارا

حرفِ عطف میں " ہور " جو دکنی سے بھی مخصوص ہے پنجابی کی نمایاں خصوصیت نہیں بلکہ مغربی ہندی کی اکثر بولیوں اور راجستھانی میں مشترک ہے ۔ مغربی روہلکھنڈ اور شمالی دوآبہ میں یہ " اور " " آر" یا " ہر" ہوجاتا ہے بلکہ دہرہ دون اور سہارن پور کے اضلاع میں یہ صاف "ہور" سنائی دیتا ہے ۔

افعال :

(۷)فعل امر کے متعلق شیرانی لکھتے ہیں ۔" امر کا قاعدہ اردو پنجابی میں بالکل ایک ہے " یعنی علامت مصدر گرادی جائے تو امر باقی رہ جاتا ہے مثلاً چلنا (چل) کرنا (کر) ۔ پروفیسر مرحوم کا یہ بیان بالکل صحیح ہے لیکن اس کے ساتھ ہمارا یہ دعویٰ بھی بالکل صحیح ہوگا کہ امر کا قاعدہ اردو اور بنگالی اردو 'اور گجراتی ' اردو اور مراہٹی میں بالکل یکساں ہے ۔ دراصل امر کا یہ قاعدہ پنجابی یا اردو کے ساتھ مخصوص نہیں ۔ ہندوستان کی تمام جدید آریائی زبانوں میں امر اسی طرح بنتا ہے۔ چل' کر وغیرہ آج پنجاب سے لے کر بنگال اور دکن تک بعینہٖ مستعمل ہیں۔ اس قسم کے ایک طرفہ بیانات عام طور سے اپنے دعویٰ کی حجّت کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ۔

(۸) لفّظ " تھا " کے متعلق پروفیسر موصوف نے ایک نئے نظریہ کا استخراج کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ملتانی زبان کے مصدر " تھیونا " (بمعنی ہونا) سے نکلا ہے۔ لکھتے ہیں :۔

> "تھا ۔ اس غریب کو لغات نگاروں نے مصدر" ہونا "کا پسر خواندہ بنادیا ہے ان کا بیان ہے کہ یہ ہونا کی ماضی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سنسکرت اور پراکرت کی آڑ میں خدا جانے ہم سے کیا کیا قبلوایا جارہا ہے۔ لیکن ایک موٹی سی بات یہ ہے۔ کہ کیا یہ ضروری ہے کہ لفظ سنسکرت کے ماخذ سے نکالا جائے ۔ اب میں بجائے اس کے کہ "تھا" کو "ہونا" کے سر باندھوں اور پھر ہونا کو سنسکرت کے " بھو" سے استخراج کروں یہ زیادہ موزوں سمجھتا ہوں کہ اس کو ملتانی زبان کے مصدر (تھیونا) بمعنی ' ہونا ' کی ماضی مان لوں " تھیونا "کی ماضی " تھیا " آتی ہے ۔ اُردو والوں نے ا سے یائے اشمام سمجھ کر

اڑا دیا اور " تھا " بنالیا ۔ " تھیا " اس قدر قدیم ہے کہ ہندی کا سب سے قدیم جملہ جو ہمیں تاریخ میں ملتا ہے اس میں یہ موجود ہے ۔"

" برکت شیخ " تھیا " اک مُوا اک نہا " (تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۳۲۱)

اُردو کے استخراج کے متعلق پروفیسر موصوف کا تاریخی اور لسانی استدلال تقریباً ہر جگہ اسی قسم کا ہے ۔ ہندی اردو کے فعل امدادی (ماضی) " تھا " کا تعلق سنسکرت کے " بھو " سے نہیں "س ڈ" स्था سے ہے ۔ اُردو: تھا پراکرت تھائ ، ٹھائ : سنسکرت استھت सिथत یہ ہے "تھا " کی لسانی تاریخ ۔ دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ " تھیونا " اور " تھیا " ملتانی میں مصدراور فعل ماضی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں ۔ لیکن ، تھیا، پنجابی اور ملتانی میں فعل امدادی ماضی کے طور پر مستعمل نہیں ۔ پنجابی کی ماضی میں فعل امدادی ساں ۔ سی اور سوں آتے ہیں ۔

جہاں تک برکتِ شیخ تھیا ، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" والے جملے کا تعلق ہے ۔ ہمیں اس میں بھي اختلاف ہے ۔ یہ شیخ تھیا " نہیں ہے بلکہ " برکتِ شیخ تھپا (یا تھبا) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " ہے شیخ تھپا سندھ میں اس عہد کے ایک بڑے بزرگ گذرے ہیں ۔

(۹) پنجابی میں گا ۔ گی ۔ گے کے علاوہ مستقبل " سی " کی تصریف سے بھی بنتا ہے جس کا تعلق لہنداؔ زبان سے ہے دکنی میں اس قسم کے مستقبل کی مثالیں مل جاتی ہیں ۔

(۱) واحد غائب = اس کتاب بغیر کوئی اپنا وقت بھلا سی نا ۔

(سب رس ص ۱۱۰)

(۲) جمع غائب = انو کے دلاں پر ایسے خطرے ہرگز نہ آسیں

(سب رس ص ۱۰۵)

(۳) واحد حاضر = جو لگن تو سب تے بے طمع نہ ہو سی ۔

(سب رس ص ۲۲)

(۴) واحد متکلم = میں ایسی نَیں ہوں ، تو پوبے پچھیں تدبیر کرنا سوں

(سب رس ص ۲۱۵)

لیکن یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ باقی صیغے یعنی جمع حاضر اور متکلم سب رس میں نہیں ملتے ۔ سب رس میں " سی " اس قدر کمی کے ساتھ ملتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں یہ متروک ہورہا تھا۔ لیکن اس " سی " کا تعلق محض لہندا سے نہیں ۔ مغربی حلقہ کی جتنی بھی زبانیں ہیں ان کی یہ علامتِ مخصوص ہے۔ راجستھانی کی اکثر بولیوں میں (گا) کے ساتھ ساتھ " سی " کا بھی استعمال ہوتا ہے ۔ میواتیوں کا دہلی بازاروں میں

قدیم زمانے سے زور رہا ہے ۔ میواتی راجستھانی ہی کی ایک بولی ہے ۔

(۱۰)غیر زبان کے الفاظ کے آخر میں یا ئے زائدہ کا اضافہ بھی پنجابی کی تنہا خصوصیت نہیں ۔ برج بھاشا، قنوجی اور اودھی بولیوں میں یہ عام طور سے پائی جاتی ہے ۔کانپور کی قنوجی میں، بعد، کو " بعدی "کہا جاتا ہے ۔

(۱۱) مانگا ۔ تانگا ۔ چپ چپاتے ۔ ہلنا جلنا وغیرہ الفاظ کو شیرانی نے پنجابی صرف اس لیے بتایا ہے کہ اس میں دوسرا لفظ جسے اور لغت نگاروں نے غلطی سے مہمل کہا ہے پنجابی میں ایک مستقل لفظ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس قسم کے دوہرے اسماء گھوڑا دوڑا، لوٹا اوٹا، میں تو عام طور سے دوسرا لفظ تابع مہمل ہوتا ہے ۔ لیکن افعال میں عام طور سے ہم معنیٰ لفظ یکجا کردیئے جاتے ہیں ۔ یہ خصوصیت ہندوستان کی تمام نئی آریائی زبانوں میں ملتی ہے جس کا تعلق براہ راست پراکرت سے ملایا جاسکتا ہے ۔

حالتِ مجروری میں " وں" کا اضافہ بھی پنجابی سے مخصوص نہیں اردو میں آنکھوں دیکھا، بمعنی آنکھوں سے دیکھا اب بھی مستعمل ہے ۔

(۱۲) مغربی ہندی اور اس کی بولیوں کھڑی، برج اور ہریانوی وغیرہ کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ اس میں (و) ہمیشہ (ب) میں تبدیل ہوجاتا ہے ۔ مثلاً ۔

سنسکرت : وِچار = بچار (برج) دکنی، ہریانوی، کھڑی)

س : وِش = بِس (برج)، کھڑی، ہریانوی وغیرہ)

وینا = بین (برج، کھڑی، ہریانوی، دکنی وغیرہ)

اسی طرح بیج، بات، برن، بید، وغیرہ مغربی ہندی کے علاقے میں عام طور سے بولے جاتے ہیں ۔ قدیم دکنی ادبیات سے حسبِ ذیل الفاظ اس رجحان کی تائید کرتے ہیں ۔

جوبن (س = یون = ق ۔ ق ۔ ۳ / ۲۴۰) برن (س = ورْن = ف ۔ ش ۔ پ) بچن (س = وچن ۔ف ۔ ش ۔پ) بات (س = وارتاف ۔ ش پ) بَست (س =وَستو(چیز' ف ۔ ش ۔ پ)بِس (س = وِش ۔ ف ۔ ق ۔ م) بجر(س وَجرُ (پتھر) ف ۔ ق ۔ م) وغیرہ ۔

مغربی ہندی کے اس اٹل صوتی اصول کے سامنے خود عربی فارسی کے الفاظ نہ ٹک سکے ۔ چنانچہ دو آبہ کے دیہاتوں میں " وکیل" کا " بکیل " " ولایت " کا " بلایت " وغیرہ اکثر سننے میں آتا ہے۔ اس کے برخلاف پنجابی میں بیشتر (و) کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ مثلاً وِچ (بیچ) وال (بال) وَڈائی (بڑائی) ویر (بیر) وچار(بچار)وگار (بگاڑ) وِش (بِس) درف (برف) وغیرہ ۔

قدیم پنجابی گروگرنڈ صاحب سے اس دعویٰ کی تائید (وچ صفحہ ۲ سطر ۱۳) ۔ وڈیائی صفحہ ۳۹۵) (وچارنا صفحہ ۱۴ پر بار بار آیا ہے) ۔وِسارنا (بسرنا، صحفہ ۲۵)

پنجابی کی طرح سندھی، لہندا اور گجراتی میں بھی یہ خصوصیت پائی جاتی ہے ۔

گجراتی	اردو	گجراتی	اردو
دنیا	بِین	وِچار	بِچار
پَروَت	پربت	وِش	بِس

پروفیسر شیرانی مذکورہ بالا صوتی اصول کی تعبیر ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔

" پنجابی اور اردو میں بعض الفاظ آپس میں تبدیل ہوجایا کرتے ہیں ۔ مثلاً پنجابی کی واؤ اردو میں (ب) سے تبدیل ہوجاتی ہے ")

لیکن اگر پروفیسر موصوف کی نظر آریائی السنۂ ہند کی تبدیلئ صوت کے اصولوں پر ہوتی تو وہ شاید اردو، پنجابی کا رشتہ اس طور پر قائم نہ کرتے ۔

(۱۴) پنجابی زبان کی ایک دوسری خصوصیت شیرانی یہ بتاتے ہیں کہ :۔

"تمام ایسے الفاظ جن میں ثانی حرفِ علّت ہو بہ تخفیف حرفِ علّت تلفظ کیا جاتا ہے ۔" مثلاً کان، ناک، بات، اور لات پنجابی لہجہ میں کَن، نَک، بت اور لَت بن جاتے ہیں یا یوں کہنا چاہیئے کہ ایسے الفاظ میں برج بھاشا میں پہلے حرفِ علّت اضافہ کردیا جاتا ہے ۔ مثلاً پنجابی " پگ " برج بھاشا میں جاکر " پاگ " بن گئی ۔ اُردو میں جو پنجابی اور برج بھاشا کے بین بین ہے اس قاعدہ کا اثر بہت نمایاں ہے اور وہ دونوں کی مقلد ہے کبھی برج کی تقلید کرتی ہے، کبھی پنجابی کی اور کبھی دونوں کی ۔ مثلاً اُردو میں "جگنا"بھی بولتے ہیں اور " جاگنا " بھی ۔ لیکن اکثر موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ اردو کا میلان زیادہ تر پنجابی قاعدہ کی طرف ہے ۔ "

پروفیسر شیرانی کے اس خیال کے متعلق ہمیں پھر کہنا پڑتا ہے کہ وہ جدید زبانوں کے مسائل پر بحث کرتے وقت پراکرت اور اَپ بھرنش کے لسانی اصولوں کو بالکل نظر انداز کرجاتے ہیں۔ آخری دور کی پراکرتوں کی یہ ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ ان میں ایسے الفاظ بکثرت ملتے تھے جن میں ایک حرفِ علّت سے پہلے مشدّد حرفِ صحیح ہوتا تھا۔ مثلاً کھگّو (کھڑگ= تلوار) مکھنّم (مکھن)وغیرہ ۔ چنانچہ اس قسم کے الفاظ سہل اس طرح بنائے جاتے تھے کہ مشدّد حرف کو سادہ تلفظ کرتے تھے اور اس سے پہلے آنے والے حرفِ علّت کو کھینچ کر ادا کرتے تھے۔ سہل بنانے کا یہ اصول شورسینی پراکرت میں کم رائج تھا یہی وجہ ہے کہ اَپ بھرنش عہد کا ادب ثقیل اور کرخت معلوم ہوتا ہے ۔ برج بھاشا میں البتّہ مشدّد الفاظ کو آسان بنالیا جاتا ہے ۔ مثلاً اردو کا، مکھن، برج بھاشا میں، ماکھن، ہوجاتا ہے ۔ ع

میّا میں نہیں کھائیو ماکھن روٹی ۔ (سورداس)

جوں جووں ہم راجستھانی ، مرہٹی ، گجراتی ، زبانوں کے علاقے کی طرف آئیں یہ رجحان بڑھتا چلا جاتا ہے ۔ حتیٰ کہ گجراتی اورمرہٹی کا یہ عام اصول بن جاتا ہے ۔ ان دونوں میں مکھن ہمیشہ ماکھن کہا جائے گا ۔ مزید مثالیں ۔

اردو	مرہٹی	اردو	گجراتی
منش	مانوس	مکّھن	ماکھن

لیکن جدید اردو کا لہجہ کافی بدل گیا ہے اور اکثر الفاظ میں وہ برج کی مقلد بن گئی ہے ۔

اردو	برج بھاشا	پنجابی
مانگنا	مانگنا	منگنا
مونگ	مونگ	مُنگ
بادل	بادل	بدّل
بیچ	بیچ	وِچ
چاول	چاول	چَول
اونچا	اونچا	اُچّا
لاکھ	لاکھ	لکھ

دکنی میں عام طور سے الفاظ کا تلفظ بہ تخفیفِ حرفِ علّت ہوتا ہے۔ مثلاً سَجن سُرَج (سورج) انگے (آگے) تُٹنا (ٹوٹنا) ڈُب(ڈوب) چند (چاند)بُند (بوند) کُئ (کوئ)(جو کوئ) بدّل (بادل)ہتّی (ہاتھی) گنگے (گھونگے) اُوپر(اوپر) بغیر(بغیر) دُسرا (دوسرا)تسرا (تیسرا) گُد(گودا) گھنگھٹ (گھونگھٹ) پرم (پریم) پرت (پریت) سُنگنا (سونگنا)منگنا (مانگنا) دُھنڈنا (ڈھونڈنا)اَسمان (آسمان) غیب (غائب)

لیکن اکثر ایسا نہیں بھی ہوتا ۔

چلی لے کے چھپ سوں پکڑ ہَت میں ہاتھ

(گلشنِ عشق صفحہ ۲۲۹ : نصرتی)

اسی طریقہ سے مانگ کر (ق ۔ ق صفحہ ۱۴۹ حالانکہ منگ کر زیادہ ملتا ہے ۔)

بولا نا ۔ چھوپاتی ۔ چھو پاکر (س ۔ رصفحہ ۲۳) سودتی (ف ۔ ش ۔ پ)

موٹی (مُٹّھی) بُلبول (بلبل)جاگا(س ۔ ر صفحہ ۱۹) چاند (س ۔ ر ۔ صفحہ ۳۴) راکھے (صفحہ س ۔ ر ۔ صفحہ ۲۱۳)

بوند (س ۔ ر ۔ صفحہ ۲۱۴)۔

کھڑی بولی کے اکثر اضلاع (مثلاً مشرقی انبالہ۔ سہارن پور، میرٹھ، مظفر نگر) میں مشدّد الفاظ کثرت سے استعمال کئے جاتے ہیں اور ہریانوی کی تو یہ عام خصوصیت ہے ۔

اس سلسلے میں یہ دلچسپ بات ہے کہ قدیم اردو اور دکنی میں مشدّد الفاظ شائستگی کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ لہجہ جتنا کھڑا ہوتا تھا اتنا ہی کھڑا سمجھا جاتا تھا ۔ اب یہ لہجہ کسی قدر گنوار و خیال کیا جاتا ہے۔ خان آرزو، دہلوی زبان کے ارتقاء کے ابتدائی مدارج ہی میں عبدالواسع ہانوسی کے ہریانوی تلفظ پر معترض تھے اورا سے گنوار و خیال کرتے تھے۔ چنانچہ فصاحت کے اعتبار سے " جگنے " پر" جاگنے " متّھے "۔ " ہت" پر" ہاتھ "۔" لکھ " پر "لاکھ "۔ "پچھے " پر" پیچھے "کو زیادہ فصیح سمجھا جاتا ہے۔اہلِ لکھنؤ دہلی والوں کی زبان کو کسی قدر کرخت سمجھتے رہے ۔ لاہور والے آج تک یوپی والوں کی زبان کو بریک (باریک) زبان کہتے ہیں ۔ دہلوی اور روہلکھنڈی لہجہ میں ایک طرح صدیوں سے اُردو کے تلفظ کا معیار متعین ہوگیا ہے ان کے کھڑے اندازِ گفتگو کے مردانہ حُسن کو آج بھی سراہا جاتا ہے۔

تخفیفِ حروفِ علّت کے لحاظ سے اردو برج اور پنجابی کے درمیان ڈولتی ہے ۔ قدیم اردو اور دکنی میں یہ تخفیف عام طور سے پائی جاتی ہے ۔ اس کا اصل سبب پنجابی نہیں بلکہ باستثناء برج بھاشا نواح دہلی کی تمام بولیوں(کھڑی بولی۔ میواتی اور ہریانوی)کی یہ عام خصوصیات ہے جس کا سلسلہ شَورسینی اَپ بھرنش سے ملتا ہے۔

جدید اردو	برج بھاشا	پنجابی	دکنی
آٹھ	آٹھ	اَٹھ	
آگ	آگ ۔ آگی	اَگّ	
آدھا	آدھا	اَدھ	آدھ (سب رس)
آنکھ	آنکھ ۔ آنکھی	اَکھ	
آگے	آگے	اَگّے	انگے(سب رس)
آج	آج	اَجّ	
اوپر	اوپر	اُوپّر	اُپر(شہ پارے)
ایک	ایک	اِکّ	ییک
بھوکا	بھوکا	بُھکاّ ۔ بُکھّا	
پوت	پوت	پُت ۔ پتّر	

پھول	پھول	پھُلّ	پھُل
چاند	چاند۔ چَندَر	چند	چاند ۔ چَندَر
سات	سات	سَت	
کام	کام	کمّ	
لاکھ	لاکھ	لکھ ۔ لک	لکھ ۔ لک (معراج العاشقین)
لاج	لاج	لجّ	
ہاتھ	ہاتھ	ہ ڈّ	ہاتھ ۔ ہت (نصرتی)
مٹّی	ماٹی	مٹّی /ماٹی	ماٹی (معراج العاشقین)
سچ	سانچ	سچ	سانچ ۔ سچ
ہاتھی	ہاتھی	ہاتھی	ہتّی (سب رس)
مُٹّھی	موٹھی	مٹّھی	موٹھی(سب رس)
مانگتا	مانگتا	مگدا	منگتا(سب رس)
مُنہ	مُنْہ	موں	موں (سب رس)
جدید اردو	برج بھاشا	پنجابی	دکنی
بتّی	باتی	بتّی	باتی(سب رس)
مچّھر	ماچھر	مچّھر	
پتّہ/پات	پات	پتّہ	پات(شہ پارے)

قدیم اردو اور پنجابی کے اختلافات

(۱) ۔ حروف ہجا میں اردو کے ڈھ ۔ جھ ۔ گھ ۔ بھ ۔ اوردھ کا تلفظ پنجابی میں مختلف طریقہ پر ہوتا ہے ۔ ان کے علاوہ (ہ) پنجابی الفاظ کے شروع میں آتی ہے ۔ درمیانی کو اہلِ پنجاب ایک خاص لہجہ میں بدل دیتے ہیں ۔ عام طور سے یہ ہمزہ (مخصوص Tone) کی آواز اختیار کرلیتی ہیں ۔ جیسے شہر = شیئر، لاہور = لو اَور یا بھوک = پوکھ ۔دھیان =دی ان ، گھوڑا = کوڑا، سمجھ = سمج، کچھ = کُچ ۔

اس کے برخلاف کھڑی بولی برج بھاشا وغیرہ میں (ہ) کا تلفظ واضح طور سے ادا کیا جاتا ہے ۔ مثلاً بارہ آنے، ڈھول، جھاڑ۔ پڑھنا۔ دھونا، بھائی ۔ (ہ) کو (ء) میں بدل دینے کے رجحان کو نووارد ترکوں اور پٹھانوں نے مزید تقویت دی ۔ فارسی اور ترکی میں یہ آوازیں مفقود ہیں ۔

لیکن پنجابی میں افعال کے آخر میں عام طور سے لہجہ کو بلند بنا نے کے لئے اس (ہ) کا بلا ضرورت بھی اضافہ کردیا جاتا ہے مثلاً کرہو، جانہہ = جان، رہاتیں = راتیں، اس کی مثالیں قدیم زما نے سے مل جاتی ہیں ۔

آدھ گرنہ ڈصاحب : سبھ (سب) بھوکھ(بھوک) گاؤ ہیں (گاویں) جا ہینہ (جانی ص ۱۵ پر) ۔

تو دریاؤ، سبھ تجھ ہی مانْہہ تجھ بِن دوجا کائی ناہ

یہ خصوصیت ہمیں کھڑی اور ہریانوی میں بھی ملتی ہے: افضل کے بارہ ماسہ (نمونہ پنجاب ممیں اردو) میں پیہہ (پیا) بیکھ (بھیک) پاہی (پائی) جلا ہے (جلا ئے) چلاہی (چلائی) چرائی(چڑھائی) باجھ (شیخ محبوبب عالم کے نمونے میں بھی باجھ" ملتا ہے ۔)

(۲) اردو میں ایک مزید آواز (ڑھ) ہے جو پنجابی میں نہیں ملتی یہ ایک علٰیحدہ اور مستقل آواز ہے جو جدیددکنی میں پائی جاتی ہے ۔ قدیم دکنی میں " ڑھ "کا تلفظ " ڑ" کے مانند کیا جاتا تھا بلکہ بیشتر اس کی قدیم شکل " ڈ" یا "ڈھ" کو برقرار رکھا جاتا تھا ۔ مثلاً بڈا ، بڈائی ۔ چڈا وغیرہ ۔

ضمائر:

زبان کے کینڈے کو متعین کرنے اور دیگر زبانوں سے اس کے صحیح رشتے کو بتا نے میں ضمائر کو جو اہمیت حاصل ہے اس کو سب قواعدنویسوں نے تسلیم کیا ہے ۔ دکنی اور پنجابی کے بنیادی اختلافات ضمائر سے اچھی طرح اجاگر ہو تے ہیں ۔ میں، میرا (س ۔ر ۸/۲۵) توں (ق ۹/۲۱) تیرا (س ۔ر(۸/۲۵)واحد متکلم اور واحد مخاطب ضمائر سے قطع نظر دونوں زبانوں کے بیشتر ضمائر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں ۔

واحد غائب۔ حالتِ فاعلی = پنجابی (ایہہ) دکنی میں عام طور سے یو (س ۔ ۲/۲۳۰) ملتا ہے ۔ موجودہ دکنی میں " یے " اور " یہ " بھی استعمال ہو تے ہیں ۔

حالتِ اضافی:واحد ہو یا جمع ، پنجابی کی حالت اضافی دکنی سے ہمیشہ مختلف ہوگی ۔ پنجابی میں (کا ، کی ، کے) بجائے (دا ، دی ، دے) آتے ہیں۔ جس کی ایک بھی مثال باوجود کوشش کے پروفیسر شیرانی کو دکنی ادب میں نہ مل سکی۔

حالتِ مفعولی : یہی حال حالتِ مفعولی کا ہے ۔ پنجابی میں یہ " نوں " کے اضافہ سے بنائی جاتی ہے ۔ ہریانی میں بھی " نوں " ملتا ہے ۔ لیکن اردو ادبیات میں (دکنی ہو یا شمالی ہند کی) اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا ۔

ضمائر کی جمع میں دونوں زبانوں کا اختلاف اور نمایاں ہوجاتا ہے ۔ یہاں دور کی بھی نسبت نہیں معلوم ہوتی ۔

فاعلی جمع متکلّم : پنجابی میں " اَسی " جو اردو یا دکنی میں کبھی بھی استعمال نہیں ہوا ۔ دکنی میں

زیادہ تر" ہمیں " آتا ہے ۔ مثلاً سب رس صفحہ ۱۴۶ " ہمیں بی عجب مرد ہیں " دیگر صفحہ ۱۸۰ اور صفحہ ۲۵۹ سب رس " ہم " بہت کم ملتا ہے ۔

مفعولی جمع متکلم : دکنی میں زیادہ تر" ہمنا" یا " ہمناکوں " آتا ہے جیسسے سب رس ص ۱۱۸، اپنے باطن کی صورت " ہمنا کون" دکھادو ۔ س ۔ رص ۳۰۰ ، ہمنا یاد کرے گا ۔

اضافی جمع متکلّم : پنجابی : ساڈا ۔ اساڈا = دکنی = ہمارا۔ ہمن (ق ۴۰ / ۴)

فاعلی جمع حاضر: پنجابی : تُسیں : دکنی : تم (ق ۲/۱۶)

اضافی جمع حاضر: پنجابی: تو ہاڈاّ، تُساڈ : دکنی : تارا(ق ۱۷/ ۶) تمن (ق ۱۷/ ۹)

فاعلی جمع غائب: پنجابی: اِیہہ : دکنی یو جو واحد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ۔

اضافی اور مفعولی حالت غائب میں پنجابی " اوہ "کی بجائے دکنی میں " وو" (ق ۶۳ / ۳) آتا ہے ۔ قلی قطب شاہ (۲/۲۵۵) میں محض (اُ) بھی ملتا ہے ان کے علاوہ اُن (ق ۵۵ / ۴) اور اُنے (س ۔ ر ۵۱ / ۱۰) بھی ملتے ہیں ۔

ضمائر اشارہ میں پنجابی اِنّا (اتنا)اور اُنّا(اُتنا) دکنی میں نہیں ملتے ۔اِتّا اور اُتّا آ تے ہیں ۔ جو شمال میں بھی رائج رہے ہیں ۔ ضمائر کے نقطۂ نظر سے قدیم دکنی کا نوا حِ دہلی کی بولیوں(کھڑی برج اور ہریانوی) سے گہرا تعلق ہے ۔

اعداد :

زبانوں کے رشتے اعداد سے بھی متعین کیے جاسکتے ہیں ۔ حروف کی طرح یہ بھی کافی حد تک تغیر پذیر نہیں ہوتے ۔ عام طور سے ہندوستان کی جدید آریائی زبانونکے اعداد ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں ۔ پنجابی اور دکنی کے اختلافات ذیل سے معلوم ہوجائیں گے ۔

پانچ: پنجابی (جدید و قدیم دونوں) میں پنج (سنسکرت پنج) مستعمل ہے جو دکنی اور ہریانوی میں نہیں ملتا ۔

تین : پنجابی میں پراکرت " تِنِی" سے نکلا " تِن " اور سنسکرت " " تری نی" سے نکلا " ترائی " دونو ں مستعمل ہیں۔ دکنی میں " ترائی " نہیں ملتا ۔ پنجابی کا " یاراں "گیارہ بھی قدیم اردو میں معدوم ہے ۔ بعض صوفیاء کے ملفوظات میں "اگیارہ "ضرور ملتا ہے ۔

بیس: پنجابی : سنسکرت و نشی سے زیادہ قریب ہے ۔ دکنی کا بیس پراکرت کی بئسی سے ماخوذ ہے ۔
س" ، کو ادا نہ کرنے کا جو رجحان پنجابی میں ملتا ہے۔ دکنی میں مفقود ہے ۔ چنانچہ پنجابی میں انیس کا اُنیّ ، اکّیس کا اِکیّ ۔ تیس کا تیہہ ، اکتیس کا اکتیّ ، پینسٹھ کا پینٹھ اور چالیس کا چالی ملتا ہے۔ البتہ وہ اعداد جن کے لیے آخر میں حرف علّت آتا ہے غنہ کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں۔ موجودہ دہلی کے باشندوں کی یہ خصوصیت ہے۔ جیسے باراں، تیراں، سولاں، ستران، (پنجابی ستاراں) وغیرہ۔

پچاس : پنجابی میں پنجاہ ہے ۔ اس کی نسبت سے اکاّون اِکو نجا وغیرہ ہوجاتے ہیں ۔

برج بھاشا اور قدیم وجدیداردو کے اکثر عدد مشترک ہیں ۔ مثلاً ایک ۔ تین ۔ چار ۔ پانچ ۔ چھ ۔ آٹھ ۔نو ۔دس ۔ بیس۔ لاکھ ۔ (برج بھاشا دیا کرن ص ٦٢ : دھریندروما)

افعال :

جہاں تک افعال کا تعلق ہے دکنی اور پنجابی میں بعض مماثلتیں بھی پائی جاتی ہیں اوربعض اہم اوربنیادی اختلافات بھی ۔

(١) پنجابی میں حالیہ ناتمام مادہ میں (دا) بڑھانے سے بنتا ہے ۔ یہ شکل قدیم و جدید اردو میں کبھی بھی استعمال نہیں ہوئی جس کی مخصوص علامت (تا) ہے جو ہریانہ اور کھڑی بولی کے اضلاع میں نمایاں طور سے ملتی ہے برج بھاشا میں یہ محض (ت) بن کر رہ جاتی ہے ۔

مادہ	حالیہ نا تمام پنجابی	حالیہ ناتمام دکنی اور اردو
مر	مردا	مرتا
نکل	نکلدا	نکلتا ۔ نِکستا
پی	پیندٖا	پیتا
جی	جیوندا	جیتا
کہہ	کہیندا	کہتا (دکنی کتّا)

اس سلسلہ میں پنجابی کی یہ خصوصیت بھی قابلِ غور ہے کہ حروفِ علّت پر ختم ہونے والے مادوں میں حالیہ ناتمام بنتے وقت (غنّہ) کا اضافہ کردیا جاتا ہے جو اردو اور دکنی میں معدوم ہے ۔

(٢) مستقبل میں (گا ۔ گی ۔ گے) کے علاوہ جو اردو اور دکنی اور پنجابی میں مشترک ہیں (وا) کی علامت بھی استعمال ہوتی ہے جس کی کوئی مثال اردوکی قدیم وجدیدادبیات میں نہیں ملتی جس طرح دکنی میں برج کی علامت مستقبل(وا) بھی

(۳) افعال امدادی میں بلحاظ اور صور دونوں زبانوں کا اختلاف اور بھی واضح ہوجاتا ہے ۔

واحد		جمع	
پنجابی	دکنی	پنجابی	دکنی
میں آں	میں ہوں	اسا آں	ہم ہیں
تو ایں	توں ہے	تُسی اُو	تم ہو
اوہ اے	وہ ہے	اوہ این	ووہیں

خاص طور سے متکلم واحد کے صیغہ میں " آں " یا " ہاں " کی شکل کہیں نہیں ملتی ۔ ماضی میں بنیادی اختلاف اور اجاگر ہوجاتا ہے ۔ پنجابی میں اس کی مختلف شکلیں ملتی ہیں ۔ دکنی میں " تھا " یا " اتھا " کی ۔

واحد		جمع	
پنجابی	دکنی	پنجابی	دکنی
میں ساں	میں تھا (اتھا)	اَسی ساں	ہم تھے (اتھے)
تو سائیں	توں تھا (اتھا)	تُسی ساؤں	تم تھے (اتھے)
اوہ سی	وہ تھا (اتھا)	اوسَن	وہ تھے (اتھے)

(۴) حالیہ ناتمام اور افعال امدادی کے مختلف ہونے کی صورت میں مرکب افعال مثلاً ماضی نا تمام (میں کرداساں) بھی لازمی طور پر مختلف ہوجاتے ہیں ۔

(۵) افعال مرکب: کسی کام کے ختم کردینے کو پنجابی میں عام طور سے بیہنا (بیٹھنا) = رہنا ، ہٹنا اور چکنا سے ظاہر کرتے ہیں ۔

اُردو اور دکنی میں رہنا ، بیٹھنا اور بالخصوص ہٹنا اس طرح مستعمل نہیں ۔ ان میں چکنا زیادہ فصیح اور با محاورہ ہے ۔ " چکنا" پنجابی میں اردو سے لیا گیا ہے ۔ کیونکہ یہ صرف شہروں میں مستعمل ہے دیہاتوں میں شاذونادر سننے میں آتا ہے ۔ ہریانی تک کے علاقے میں " چکنا " کا مفہوم " لیا" سے ادا کیا جاتا ہے ۔

ایک اور بڑا اختلاف یہ ہے کہ اردو میں سنسکرت (کتا क کات त) ہمیشہ حذف ہوجاتا ہے ۔ پنجابی میں یہ کبھی نہیں ہوتا ۔ جیسے

س = کِرتہ	اردو = کیا	پنجابی = کیتا
س = وِتّہ	اردو = ویا	پنجابی = وِتّا
س = سپتہ	اردو = سویا	پنجابی = سُتّا

پنجابی میں کیتا ، وِتّا وغیرہ میں ت = त) کا برقرار رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا تعلق لہندا سے

بہت گہرا رہا ہے۔ دکنی میں کہیں کہیں (کیتا) کی شکل نظر آجاتی ہے۔ جیسے کیتا آواز، کیتی عرض ۔ (اردو شہ پارے: مثنوی بہرام بانو ۔ امین ص ۲۱۲) لیکن یہ اس میں مستقل صورت نہیں اور بعد کو متروک سمجھی جانے لگی ہے ۔پھر یہ کہ وِتّا، سُتّا ۔ وغیرہ کی مثالیں نہیں ملتیں ۔

حروف:

پنجابی کے بعض عام مستعمل حروف دکنی میں نہیں ملتے ۔

نوں = (کو) دکنی میں کویا کوں مستعمل ہے۔ نوں ۔ پانی پت اور کرنال کے اضلاع تک سنائی دیتا ہے ۔

وِچ = اردو دکنی "بیچ" یا میں، وچ قدیم و جدید پنجابی کے ساتھ مخصوص ہے(ص ۲/۱۳ آدھ گرنڈ صاحب)گو "مِیں" بھی آدھ گرنڈ صاحب میں پایا جاتا ہے ۔

: (ص ۲/۱۴ آوگرنڈ) اردو دکنی کے ساتھ سنگ (ف ۔ ق ۔ م) کا مترادف ہے۔

توڑی، تاڑی: تک کے معنوں میں آتا ہے ۔ دکنی میں "لگ" ہے جو آوٗ گرنڈ ص ۲۵، ۲۷ میں بکثرت ملتا ہے اور لاہور سے لے کر اودھ تک کے دیہاتی رقبوں میں آج بھی سنا جاتا ہے ۔

کول، کوے: پاس کے معنوں میں پنجابی میں مستعمل ہے ۔ دکنی میں مفقود ہے۔ وانگوں، وانگر: مثل کے معنوں میں آتا ہے ۔ دکنی میں سنسکرت کا صَم (ف ۔ق ۔ م) بھی مستعمل تھا ۔

نیڑے: نزدیک دکنی (نزدیک ۔ ق ۔ق ۔ م) یا کَن، کَنے ۔(ف ۔ ق ۔ م) پنجابی سے مخصوص ہے ۔

سمت کے اظہار کے لیے پنجابی میں ارے، ارار، دل، سوا وغیرہ آتے ہیں جو دکنی میں نہیں ملتے ۔

ہن: دکنی میں اب اتال یا ہبے (ف ۔ ق ۔ م) آیا ہے ۔

پنجابی میں مختلف اوقات کے اظہار کے لیے ویلا (بیلا) اضافہ کردیتے ہیں ۔ دھّمی ویلا (علی الصباح) یہ شکل دکنی میں نہیں ملتی ۔

پنجابی میں بھیتر، کم، اور، اندر، زیادہ استعمال ہوتا ہے ۔ دکنی میں، بھیتر کے ساتھ، بھترال، (ف ۔ ق۔م) کی شکل بھی نظرآتی ہے ۔

(۷) پنجابی زبان کے بعض عام مستعمل اسماء اور افعال دکنی میں نہیں ملتے ۔

اسماء: پیو (باپ) بھرا (بھائی) پُت ۔ پتر (بیٹا) وا (ہوا) ویر (بیر) دَستُ (س: وسِتُ ۔چیز) وہٹی ۔ رّن (بیوی) دِھی ۔ کاکی ۔ کڑی (بیٹی ۔ لڑکی) کُکڑّ (مرغ) دال ۔ کیس (بال) روکھ (دکنی، جھاڑ) نِکا (چھوٹا) واج (آواز) ورودھ (دشمنی)

افعال: گھالنا (بمعنیٰ بھیجنا جو جدید پنجابی میں مستعمل ہے (پہنچانا = آدگرنڈ ص ۷ / ۲۷) دھیانا (ا ۔ گ ۔ ص ۲۷/۶) بھیا ۔ بھئے (ہوا۔ ہوئے ۔ا ۔ گ ص ۲۶/۱) وِسارنا (دکنی بِسرنا ۔ا ۔ گ ص ۲۵/۶) دیکھنا

(دیکھنا ا۔ گ۔ ص ۷ / ٦)۔

یہاں یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ صوتی اعتبار سے بمقابلہ پنجابی دکنی " ب " کی آواز کو پسند کرتی ہے ۔ پنجابی میں وال (بال) وِچارنا (بچارنا) وِسارنا (بسرنا) وغیرہ آتے ہیں جو مغربی ہندی کے صوتی اصولوں پر ڈھل کر دکنی میں مستعمل ہوتے ہیں ۔

مزید مثالیں :

پنجابی	دکنی	پنجابی	دکنی
دِس ۔ وِکھ	بِس	دات	بات
واگاں	باگاں (جمع باگ)	وچارنا (بچارنا)	(ف۔ ق ۔ م)
ویچنا	بیچنا	وسنا	بسنا
دار	بار	دَسْت	بَسْت (ف ۔س ۔ ر)
وڈھائ	بڈائی (ف ۔ س ۔ ر)	ورت	برت (روزہ)

قدیم دکنی اور پنجابی کے مذکورہ بنیادی اختلافات کے باوجود پروفیسر شیرانی کے اس دعویٰ میں کافی حد تک صداقت ملتی ہے کہ قدیم دکنی پنجابی سے مماثل ہے۔لیکن صوتیاتی اور صرفی و نحوی لحاظ سے دکنی کے "پنجابی پن "کی توجیہہ نواح دہلی کی دوبولیوں (کھڑی، ہریانوی) سے بھی ہوسکتی ہے ۔ کھڑی بولی کے ارتقا کے بارے میں خود گریرسن متضاد باتیں لکھ گیا ہے۔ ایک طرف وہ پنجابی زبان کو "ملواں" زبان کی صف میں جگہ دیتا دوسری طرف کھڑی بولی کو وہ برج بھاشا کی ایک ایسی شکل مانتا ہے جو پنجابی میں بتدریج ضم ہوتی چلی گئی ہے۔ تیسری طرف مجموعی حیثیت سے حکم لگاتے ہوئے وہ اور چارلس لائل دونوں کھڑی بولی کو برج بھاشا سے دوسری بولیوں کی بہ نسبت قریب ترکہتے ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ شمالی ہند میں برج بھاشا کھڑی بولی سے بہت پہلے ادبی شکل اختیار کرچکی تھی ۔ قدیم اردو پر پنجابی زبان کے بعض اثرات کا تسلیم کرنا بھی ناگزیر ہے جس نے " زبان دہلی " کے ارتقاء میں مہمیز لگائی لیکن حقیقت یہ ہے، جیسا کہ ڈاکٹر چٹرجی نے اپنی تصنیف میں اشارہ کیا ہے ۔ قدیم عہد میں لاہور سے لے کر الہٰ آباد تک کی زبان میں بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ مغربی یوپی اور مشرقی پنجاب کی بولیاں آج بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اس زمانے میں اور قریب تھیں، جدید آریائی بولیوں کے طلوع کا زمانہ سن ۱۰۰۰ء سے پیچھے نہیں لے جایا جاسکتا ۔ اس لیے قدیم دکنی کا جواز جدید پنجابی میں نہیں ڈھونڈنا چاہیئے۔ بولی کی حیثیت سے اگر کسی کو قدیم دکنی سے گہری نسبت ہوسکتی ہے تو وہ دہلی کے نواح کی دو بولیاں ہیں۔ یعنی کھڑی اور ہریانوی۔ اس سلسلے میں برج بھاشا کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔ کیونکہ شہر دہلی ان تمام بولیوں کے نقطۂ اتصال پر واقع ہے۔ ہمارا خیال

ہے کہ دکنی کے ، " پنجابی پن " کی تو جیہہ حسب ذیل ضلعوں کی بولیوں سے کی جاسکتی ہے ۔

(۱) کھڑی کے اضلاع : سہانپور، مظفرنگر۔ میرٹھ اور غازی آباد ۔

(۲) ہریانوی کے اضلاع : کرنال ، رہتک ۔

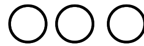
(۳) برج کا ضلع : بلند شہر ۔ متھرا ، آگرہ ۔

ان میں دکنی اور قدیم اردو کے نقطۂ نظر سے میرٹھ اور رہتک کے اضلاع کی بولیاں بہت اہم ہیں ۔ انھیں علاقوں کے رہنے والوں پر قدیم دہلوی سماج کے وہ مختلف طبقات قائم ہوئے تھے جو کئی قسم کی ملی جلی بولیاں بولتے تھے ۔ ان سب پر ترک افغانی سماج کا ٹھپہ تھا ۔ ابتداء میں شہر دہلی میں خسروکی " زبان لاہوری " کا اثر بھی تھا ۔

محمود شیرانی اور ڈاکٹر زورؔ دونوں ہی اپنی تحریروں میں یہ ثابت کرنے سے قاصر ہیں کہ پنجاب سے کبھی بھی اتنے وسیع پیانے پر ہجرت ہوئی ہے جس کی مثال موجودہ شہر دہلی ہے ۔ آج بھی کئی لاکھ کی آبادی کے ردّوبدل کے باوجود قطع نظر شہر دہلی کے آس پاس کے اضلاع کی بولیوں کا اقتدار قائم ہے ۔

پروفیسر ژول بلوک نے اپنی تحریروں میں اردو کی ابتداء کے سلسلہ میں صرف ہریانوی زبان پر زور دیا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے " ہندوستانی لسانیات " میں ہریانوی کے اثرات کا تذکرہ کیا ہے اردو کی ابتدا اور ارتقاء کے سلسلے میں جس نظریہ کا خاکہ ہم نے اس کتاب میں تیار کیا ہے ۔ اس میں زور نواح دہلی کی تمام بولیوں پر ہے جن کے سنگم پر شہر دہلی واقع ہے ۔ دکنی کی غرابت اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ ہم معیاری اردو سے قطع نظر نواحِ دہلی کی بولیوں کا لسانی جائزہ نہیں لیتے ۔ محمود شیرانی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پنجابی اور دکنی کی مماثلت اپنی تصنیف میں پیش کی ۔ جدید تحقیق صرف اس بات کی منتظر تھی کہ دکنی کی ان خصوصیات کو جنھیں پنجابی سے منسوب کیا گیا ہے نواحِ دہلی کی بولیوں سے ثابت کردے ۔ کیونکہ پچھلے ابواب میں یہ بات تو مسلم ہوگئی ہے کہ ہریانوی اور کھڑی (نواحِ دہلی کی بولیاں) مسلمانوں کی فتح دہلی کے بعد کا ارتقا نہیں ۔

اس تحقیقی کام کے سلسلے میں تاریخی مواد ہم صرف ہریانوی کا فراہم کرسکے ہیں کھڑی کی جدید شکلوں پر ہی اکتفا کیا گیا ہے ۔ اس سلسلے میں شمالی ہند کی اردو کے قدیم ادبی نمونوں پر بھی نظر رکھی گئی ہے ۔



پانچواں باب

" زبانِ دہلی و پیرامنش" (خسروؔ)

اردو کی ابتدا پر تحقیقی کام کرنے کے لیے قدیم ترین مواد دکنی اُردو کے نمونوں میں دستیاب ہے۔دکن میں یہ زبان شمالی ہند سے پہونچتی ہے۔ اردو کے محقیقں نے دکن میں اس زبان کی اشاعت کا سلسلہ علاء الدین خلجی کی فتوحاتِ دکن ۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء سے قائم کیا ہے. زبان دہلی کی دوسری بڑی لہر ۱۳۲۷ء میں سلطان محمد بن تغلق کے ساتھ پہونچتی ہے۔جس نے دولت آباد کو دارالسلطنت قرار دیا۔ہر چند شمال اور دکن کے تہذیبی و سیاسی روابط اس سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔

روایات کے دُھندلکے سے نکل کر تاریخ کی روشنی میں آئیے تو چالو کیہ اور یادو خاندانوں کے عہدِ حکومت میں دکن اور شمالی ہند کے گہرے تعلّقات ثابت ہو تے ہیں۔لیکن اب تک لسانی اثرات کے شواہد بہت کم مِل سکے ہیں۔"دکن کا پدیہ اور گدیہ" کے مصنفّ نے جو مہا اور اَپ بھرنش کے مصنفّین کی تحریروں سے دکنی زبان کا آغاز کیا ہے وہ بقول چٹرجی صحیح نہیں۔ اِس لیے لسانی نقطۂ نظر سے دکنی زبان کے قدیم ترین نمونے وہ قرار دیئے جائیں گے جو اُردو رسم الخط میں لکھے ہوئے سلطنت بہمنیہ کے قیام کے بعد سے دکن میں دستیاب ہیں۔

" زبانِ دہلی" ترکوں اور افغانوں کی قیادت میں جمنا پار کے جاٹ اور گوجر دکن لے جاتے ہیں ۔شہر دہلی تین بولیوں کے سنگم پر واقع ہے۔ جمنا پار مغرب میں ہریانوی رائج ہے۔شمال مشرق میں کھڑی اورجنوب میں برج کا علاقہ ہے۔اردو کے ارتقا میں ان تمام بولیوں کے اثرات مختلف زمانوں میں پڑتے رہے ہیں۔دکن کی زبان کا محاورہ سلاطینِ دہلی کے عہد کی یادگار ہے جب کہ آگرہ کی برج کے اثرات ہنوز نہیں پڑے تھے۔ دہلی میں بولیوں کی آنکھ مچولی کی داستان تفصیل سے بیان کرنا ناممکن ہے۔اِس لیے کہ اس عہد کا تحریری مواد تقریباً مفقود ہے۔البتہ صوفیہ کے اقوال اور ملفوظات میں جو جابجا " زبان ہندی " یا ہندوی کے بکھرے ہوئے فقرے ملتے ہیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ جاٹوں اور گوجروں کی زبان کا محاورہ اس زمانہ میں غالب تھا۔یہی لسانی سطح دکن میں پہونچتی ہے۔چونکہ ہریانوی اور پنجابی میں بہت سے عناصر مشترک ہیں۔اس بنا پر پروفیسر شیرانی دکن کے لسانی مواد کا مقابلہ پنجابی سے کرکے سلسلہ اس سے مِلادیتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ خسروؔ کی زبانِ دہلی میں ایک سے زیادہ بولیوں کا محاورہ لسانی ارتقا کی جولاں گاہ میں آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔دکن میں بھی ایک سے زیادہ بولیاں پہونچی ہیں اس لیے اردو کی ابتدا کے سلسلے میں نئے نظریے کی تشکیل اس طور پر کی جاسکتی ہے کہ ہم اپنے پہلے زبان شناس امیر خسروؔ کی زبانِ " دہلی وپیرامنش " سے اشارہ لے کر نواحِ دہلی کی بولیوں کا تقابلی مطالعہ کریں

اور دکنی زبان کی خصوصیت کو پنجابی کے بجائے ان میں پہچاننے کی کوشِش کریں ۔ایسا کرتے وقت ان بولیوں کے جدید رُوپ ہی پیشِ نظریہ رہیں بلکہ ان قدیم نمونوں کا بھی جائزہ لیں جو دستیاب ہیں ۔مذکورہ بالا تقابلی مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے کہ قدیم اردو کی تشکیل براہ راست دوآبہ کی کھڑی اور جمنا پار کی ہریانوی کے زیرِ اثر ہوئی ہے ۔اور جب سولھویں صدی میں آگرہ دارالسطنت بن جاتا ہے اور کرشن بھگتی کی تحریک کے ساتھ برج بھاشا عام مقبول زبان ہوجاتی ہے تو سلاطین دہلی کے عہد کی تشکیل شدہ زبان کی نوک پلک برجی محاورے کے ذریعہ درست ہوتی ہے ۔اُردو اور برج کے عنوان کے تحت اس کی تفصیل دی جاچکی ہے ۔فی الحال ہریانوی اور کھڑی سے بحث کی جائیگی۔

اُردو اور ہریانوی

قدیم دکنی زبان کے مطالعہ کے سلسلے میں اب تک ہریانوی کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے ۔حالانکہ یہی زبان ہے جو قطع نظر شہر دہلی، ضلع دہلی میں آج بھی بولی جاتی ہے ۔پروفیسر شیرانی ا سے قدیم اردو کی ایک شکل گردانتے ہیں ۔ اُردوئے قدیم سے متعلق لسانی تحقیق کے سلسلے میں جو اہمیت اس کو حاصل ہے اس کی طرف سب سے پہلے اشارہ پروفیسر ژول بلوک نے اپنے ایک مضمون" ہند آریائی لسانیات کے بعض مسائل " میں کیا ہے۔پروفیسر موصوف لکھتے ہیں۔

> "اس میں شک نہیں کہ پنجاب پہلا صوبہ ہے جو مسلمانوں کے زیرِاقتدار آیا اور عرصہ تک رہا۔اسی لیے پنجابی اور اُردو کی مماثلت یاد رکھئے۔ لیکن یہ اس قیاس کے مانع نہیں کہ ہندی لشکروں کے جو لوگ پہلے پہل اپنی زبان کو دکن لے گئے پنجاب سے متعلق تھے، بلکہ مشرقی پنجاب کے ضلع انبالہ اور شمالی دوآبہ سے تعلق رکھتے تھے. مغربی روہیلکھنڈ کے متعلق میں تحقیق سے نہیں کہہ سکتاکیونکہ ان اضلا ع کی اُردو نما زبان شاید بعد کے اثرات کی پیداوار ہے ."

آگے چل کر پھر لکھتے ہیں :۔

> " لہٰذا میرے خیال میں مشرقی پنجاب کے اضلا ع کی زبان لشکریوں کے ذریعہ دکن تک پہونچتی ہے جس نے مرورِ ایام سے شستہ ادبی زبان کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔
> (ص ۲۹ہ۔ ۳۰ہ۔ B.S.O.S ۱۹۲۸ء۔ ۱۹۳۰ ء)

بعد کو ژول بلوک کی تحریروں ہی سے متاثر ہوکر ہریانوی کی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر زور آپنی کتاب " ہندوستانی لسانیات " میں یوں رقم طراز ہیں :

یہاں ایک اور بات مدنظر رکھنی چاہئیے کہ اردو پر بانگرو یا ہریانی زبان کا بھی قابلِ لحاظ اثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبانِ دہلی کے شمال مغرب میں انبالہ کے اطراف میں اُس علاقہ میں بولی جاتی ہے جو پنجاب سے دہلی آتے ہوئے راستہ میں واقع ہے اور دہلی پر حملہ کرنے والوں یا وہاں کےحکمرانوں کے ہمراہ اسی علاقہ کے رہنے والے بھیرو بنگاہ کی حیثیت سے دہلی اور اس کے نواح میں آکر آباد ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاتح و مفتوح کے میل جول سے جو زبان بنتی چلی آرہی تھی اس میں ہریانی عنصر بھی شامل ہو گیا۔"

(صفحہ ۹۰ لسانیات ۱۹۳۲ء حیدر آباد دکن)

ژول بلوک کے مذکورہ بالا اشارات سے لسانیاتی تحقیق کا ایک نیا باب کھُل جاتا ہے۔ لیکن ہریانوی سے متعلق لسانیاتی تحقیق کے سلسلے میں بعض دشواریاں حائل تھیں۔

(۱) قدیم ادبی نمونوں کا فقدان۔

(۲) ہریانوی زبان کی کسی قواعد کا دستیاب نہ ہونا۔

پہلی کمی کو پروفیسر شیرانی کے ان مضامین نے کسی حد تک پورا کردیا ہے جو اورینٹل کالج میگزین کے نومبر ۱۹۳٦ء اور فروری ۱۹۳۲ء کی جِلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اس طرح ہمارے سامنے ہریانوی کے کئی قدیم مصنفّوں کے ادبی نمونے آجاتے ہیں جن میں شیخ عبداللہ انصاری، شیخ محبوب عالم ساکن جھجھر، اکرم رہتکی المختلص بہ قطبی، شاہ عبدالحکیم، شاہ غلام جیلانی رہتکی قابلِ ذکر ہیں۔ مذکورہ بالا مصنفّوں کے علاوہ لسانی نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ قابلِ تصانیف عہدِ عالمگیری کے مشہور فارسی داں میر عبدالواسع ہانسوی کی صمد باری اور فرہنگ غرائب اللغات ہیں۔ صمد باری، خالق باری کے طرز پر لکھی ہوئی، تین زبانوں کی فرہنگ ہے غرائب اللغات کا اصل نسخہ مفقود ہے۔ البتہ سراج الدین علی خاں آرزو کے تصحیح شدہ نسخے تصحیح " غرائب اللغات ہندی" کے نام سے متعدّد کتب خانوں میں ملتے ہیں۔ خان آرزو، عبدالواسع کی زبان کو معیاری نہیں مانتے ہانسی چوں کہ ہریانہ کے علاقے میں ہے اس لیے ہندی الفاظ کی فصاحت کا معیار عبدالواسع یہیں کی بولی سے متعین کرتے ہیں۔ خان آرزو زبانِ وطن مصنفّ ہریانی کو فصیح نہ مان کر برج گوالیری کو " افصح السنہ ہند" قرار دیتے ہیں۔

دوسری یعنی قواعد کی کمی کو کسی حد تک ان لسانی نوٹوں سے پورا کیا گیا جو راقم السطور نے دہلی کے اطراف ومضافات سے مختلف ذرائع سے حاصل کیے ہیں۔ گریرسن کے عدیم المثال لسانیاتی جائزۂ ہند میں بھی اس غریب بولی کے متعلق تفصیل سے نہیں لکھا گیا ہے۔ نہ تو اس کی قواعد کا دیگر بولیوں کی طرح خاکہ دیا گیا ہے

اور نہ ہی فرہنگ میں اس کے الفاظ کو جگہ دی گئی ہے ۔ہریانوی زبان کی جاٹو زبان کے نام سے ایک مختصر سے فرہنگ جنرل ایشیا ٹک سوسائٹی بنگال ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی جس کے مصنّف مسٹر ای جوزف آئی .سی۔ایس تھے گریرسنؔ نے اپنے " لسانیاتی جائزہ ہند " میں اس سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔

اِس سلسلے میں حال کی دو اہم تصانیف کا ذکر ضروری ہے جو مقدمہ تاریخ زبان اُردو کی پچھلی اشاعتوں کے وقت دستیاب نہیں تھیں ۔پہلی ڈاکٹر جگدیوسنگھ کی " بانگڑوں کی توضیحی قواعد" (انگریزی ۱۹۷۰ء) اور دوسری ڈاکٹر رام بلاس شرما کی " بھارت کے پراچین بھاشا پریوار اور ہندی " (ہندی : ۱۹۷۹ء) جس میں ہریانوی کی لسانی اہمیت اور اس کے تاریخی کردار پر نہایت عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے ۔ ۱۹۸۵ء میں ہریانہ ساہتیہ اکادمی نے " ہریانوی ۔ہندی کوش " شائع کی ہے۔

(۱) ہریانوی اور قدیم دکنی میں بعض صوتی مما ثلتیں پائی جاتی ہیں ہریانوی میں اردو کی " ڑ " کی جگہ "ڈ" کا استعمال کثرت سے پایا جاتا ہے۔

مُلاّ وجہی نے سب رس اور قطب مشتری میں (دیکھئے فرہنگ) چھوڑ کو چھوڈ ، پڑھے کو پڈھے ، بڑا کو بڈا ، چڑھنا کو چڈھنا لکھا ہے جو بعینہٖ ہمیں ہریانی کے قدیم مصنّف شیخ عبدی کے فقۂ ہندی (۱۰۷۴ ھ) میں ملتے ہیں ۔(ڑ) پر (ڈ) کو ترجیح عبدالواسع نے بھی دی ہے .مثلاً" اساڑھ "کی بجائے " اساڈھ " ۔ بڑبھس کی بجائے " بڈبھس" بڑھنا کی بجائے "بڈھنا" بھیڑ کی بجائے " بھیڈ " پیڑو کی بجائے " پیڈو" جو آج بھی ہریانوی اور کھڑی کے ملحقہ علاقوں میں مستعمل ہے۔

شیخ عبدی کے فقہ ہندی میں ہمیں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جس میں ہریانوی زبان کے عام اصول کے مطابق حرف کی حرکت سے متاثر ہوکر حرفِ علّت کا اضافہ کردیا جاتا ہے۔

مثلاً : بُرائی = بورائی — رکھے = راکھے
سچ = سانچ — سکھانا = سکھاونا
تئیں = تائیں — ہڈی = ہاڈ
لہو = لوہو

غرائب اللغات

باندھ ۔ بجائے بند — باندر۔ بجائے بندر
تھانولا ۔ بجائے تھالا — ساتو۔ بجائے ستو
پھونکنی ۔بجائے پھکنی — تاپ ۔ بجائے تپ

ان میں اکثر الفاظ قدیم دکنی ادبیات میں اسی تلفّظ کے ساتھ مِل جاتے ہیں۔راکھے۔ تائیں۔ ہاڈا اور لوہو کے لئے دیکھئے فرہنگ سب رس۔مزید مثالیں شہ پارے جلد اوّل کے فرہنگ سے مِل جاتی ہیں۔بلانا = بولانا، چھپاتی = چھوپاتی۔

شیخ محبوب عالم ساکن جھجھر دوسرے ہریانی مصنّف کے محشر نامہ میں لاگا (لگا) ماٹی (مٹی) راکھوں (رکھوں) چالیں (چلیں) ہاڈ (ہڈی) وغیرہ مِل جاتے ہیں۔

دکنی میں غنّہ کے کثرتِ استعمال کی توجیہہ بھی پنجابی سے نہیں ہریانوی سے کی جاسکتی ہے۔

جیسے دکنی ادبیات کے سیں (سے) کوں (کو) توں (تو) یا علامتِ مصدر نا کو، ناں، بولنا (چلناں ،کھاناں، جاناں) یا کونچے، کونْچے۔س، ر، ص ۹/۴۹۔

سنْتانا (ستانا ف ؛ ق ۔ م) آدمیں (آدمی) ف ۔ق ۔م) برسانْت (برسات ف ۔ق ۔م) وغیرہ براہ راست ہریانوی سے متاثر نظر آتے ہیں.شیخ محبوب عالم کے محشرنامہ میں ذیل کے الفاظ غنہ کے ساتھ درج ہیں۔

پہلیں (پہلے) نانْچیں۔بنْچانی (بچائی) مانْس (ماس) سیں، کوں، تو وغیرہ۔

دہلی کے قدیم باشندوں کی گفتگو میں یہ الفاظ آج بھی سُنائی دیتے ہیں۔خالق باری میں، وہی، کے بجائے ، وہیں، ملتا ہے ۔ملا وجہی سب رس میں " وہیں " ہی لکھتے ہیں ۔لیکن حضرت امیر خسرو نے اپنے ایک شعر میں "وہی " قافیہ کیا ہے

گجری کہ تو درحسن و لطافت چومہی

ہر گاہ بگوئی کہ " دہی لیہو دہی "

ہریانوی اور قدیم دکنی دونوں میں ,جھ، بھ، چھ، دھ، وغیرہ کا تلفظ سہل اور سادہ ہوجاتا ہے جیسے بھی (بی) مجھ (مج) کُچ (کچھ) (دیکھئے سب رس اور ہریانی زبان کے نمونے گریرسن ۔لسانی جائزہ ہند جلد نہم حصّہ اول)

(۲) دکنی میں اور ہریانوی میں جمع بنانے کا طریقہ بھی مشترک ہے ۔دونوں میں اردو کے معیاری قاعدے " وں " کے اضافے کے برعکس " آں " لگا کر بناتے ہیں ۔اس کی توجیہ پنجابی سے کی گئی ہے لیکن ہریانوی سے بھی ہوسکتی ہے۔ شیخ محبوب عالم کے محشرنامہ میں جمع اس طور ملتی ہے۔

ٹکراں غریباں جھوٹاں اوٹناں

لیکن چونکہ اورنگ زیب کے عہد میں اردو جمع بنانے کا قاعدہ متعین ہوچکا تھا اس لئے "کان "کی جمع "کانوں " اور "گمان "کی جگہ "گمانوں " مِل جاتی ہے۔جدید ہریانوی میں : گھوڑاں۔ دناں۔ کھیتاں وغیرہ۔

(۳) دکنی میں ماضی قریب وفعل حال میں ، سے، ، سوں ، ، سیں، اور ،ساں ، مطلق نہیں مِلتے جو

پنجابی زبان سے مخصوص ہیں۔موجودہ ہریانوی میں بھی یہ پائے جاتے ہیں۔لیکن قدیم ہریانوی کے مصّنفوں کے یہاں نہیں ملتے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ ہریانہ علاقہ میں یہ بعد کو پنجابی اثرات کے تحت رواج پاگئے ہوں گے۔
(دیکھیے محشرنامہ محبوب عالم)

(۴) اُردو کی معیاری فعلیہ شکل کھاکر، جاکر، آکر کی بجائے شیخ محبوب عالم کے محشر نامہ میں یائے زائدہ کے ساتھ آئے کر، کھلائے کر، اُٹھائے کر، اوچائے کر، پروئے کر اور لائے کر ملتے ہیں ۔ وجہی کی ایک غزل دیکھیے۔

پیوں اپنے کوں ٹک آج میں سپنے دیکھے سوئے کر

میں روئے کر، ہوئے کر، کوئے کر، کھوئے کر قافیہ کے طور آئے ہیں۔

(۵) افعال امدادی میں ہریانہ کے " سوں " " سیں " اور " ہوں " ہیں ۔ زمانۂ حال میں دونوں شکلیں ملتی ہیں۔دکنی میں پہلی شکل نہیں ملتی۔جدید ہریانوی میں یہ پنجابی کے اثر سے آئی ہے۔

(٦)موجودہ اُردو کا فعل احتا لیہ ہریانوی میں اپنے اصل مفہوم یعنی محض حال کے معنوں میں مستعمل ہے جس کی گردان حسب ذیل ہوگی۔

	واحد	جمع
متکلم	ماروں۔ ماراں (میں مارتا ہوں)	مارائیں ماریں ماراں
حاضر	مارائی۔ مارے	مارو
غائب	مارائی۔ مارے	مارئیں ۔ ماریں

جو دکنی سے قریبی مماثلت رکھتی ہیں ۔

(۷) اُردو میں ایسے مصادر کے ماضی مطلق جن میں علامتِ مصدر سے قبل (ا) یا (و) نہیں ہوتا۔اس طرح بنتی ہے کہ امر کے آگے (ا) بڑھادیتے ہیں ۔لیکن دکنی میں بجائے (ا) کے " یا " لگادیتے ہیں ۔مثلاً ماریا، رہیا، چلیا، کہیا، کھلیا، لگیاں، قدیم و جدید ہریانوی میں یہ بعینہٖ اِسی طرح ملتے ہیں .صرف رہتک کی زبان میں کہیہ کا کہا، لگیا کا لگا اور چلیا کا چلا ہوتا جاتا ہے۔جو یقیناً کھڑی بولی کے اثر سے ہے۔

(۸) دکنی کے ضمائر بھی پنجابی کی بہ نسبت ہریانوی سے زیادہ قریب ہیں ۔جن ضمائر کی توجیہ شیرانی پنجابی سے کسی طرح نہیں کرسکے وہ ہریانوی میں جوں کے توں ملتے ہیں۔متکلم جمع ہریانی میں ہم اور ہمیں آتا ہے ۔دکنی میں بھی ہم اور ہمیں ۔(ف ۔س ۔ر) مستعمل ہے ۔پنجابی میں اس کے برعکس 'اَسی' ملتا ہے جو دکنی میں کبھی استعمال نہیں ہولۓ حاضر جمع۔ پنجابی تُسی ہے : ہریانی تَم (کھڑی بولی کے علاقے میں بھی اس کا یہی تلفّظ ہے) اور تمہیں ہے۔ دونوں دکنی میں مِلتے ہیں۔(تَم کا تلفّظ تُم ہوجاتا ہے)۔

دیگرضمائربھی دونو ں زبانوں کے یکسا ں ہیں۔

ضمائراشارہ : اردو :یہ دکنی : یو۔ ہریانی : یو۔ یوہ۔

اُردو =اِس۔ دکنی۔ اِس ہریانی : اِس " پنجابی ایس ہے۔"

اسی طرح جو۔ جس۔ کون اور کسی بھی مشترک ہیں۔

قدیم ہریانی میں (شیخ محبوب عالم کے محشرنامہ میں) حسب ذیل ضمائر ملتے ہیں۔وہ ، یہ ، اے ، وے ، اس ، ان ، یو ، تس ، تَیں ، توں ، توہ ، تجھ ، تم ، تیرا ، تیرے ، تیری ، میں ، مجھ ، میرا ، میری ، ہم ، ہمارا۔

جو دکنی اورہریانوی میں مشترک ہیں۔

ضمائرمیں تصرّف دکنی کے طرز پر ہے۔مثلاً ہم سے ہموں ، ہمیں۔تم سے تموں ، تمھیں۔اُن سے اُنہاں ، انہوں (دکنی انوں)۔

(۹) ہریانی زبان کے عام مستعمل حروف جو اس کی قدیم تالیفات سے اکٹھے کئے جاسکے ہیں حسب ذیل ہیں۔

شیخ عبداللہ انصاری : مانْہہ ، مِیں ، سوں ، نانْہہ (نہیں) ، آگوہ (آگے) ، پچھوں (پیچھے)۔

شیخ محبوب عالم : کو ، بہت ، میں ، ماں ، ماہیں ، بیچ ، بچ ، سیں ، کوں ، پَر ، موں ، میں ، ماں ، مانجھ ، (درمیان) اندر۔ علاوہ ازیں تے ، تھے اور سیتی عام مستعمل حروف ہیں جو دکنی اور ہریانی دونوں میں مشترک ہیں

کھڑی ، ہریانوی اور دکنی ایسی زبانیں ہیں جن میں قدیم زمانے سے حروف " نے " علامتِ فاعلی اور مفعول دونوں طرح سے مستعمل ہوتا چلا آیا ہے۔اردو میں " نے " صرف فاعل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور وہ بھی افعال متعدی میں چونکہ یہ سنسکرت کے مفعول " لگیا" سے نکلا ہے (لگے ، لے ، نے) اِس لئے بیشتر زبانوں میں یہ علامت مفعول ٹھہرایا گیا ہے لیکن اردو میں چونکہ "کو " علامتِ مفعول موجود ہے اس لئے یہ فاعل کے ساتھ مخصوص ہوگیا۔

جدید ہریانی : من نے صاحب نے مارا (مجھے صاحب نے مارا) (فاعل ، مفعول ایک ساتھ)

قدیم دکنی : فاعل : اس خاطر زلیخا نے کیا کری۔(سب رس۔ص ۵۶)

مفعول : آدمی بُرا اچھے تو شراب نے کیا کرنا۔(سب رس۔ص ۳۱)

اُردو اور کھڑی بولی

لائل اور گریرسن ان دونوں نے اردو / ہندی کی بنیاد کھڑی بولی (ورناکلر ہندوستانی) کو تسلیم کیا ہے۔ان کے بعد اُردو ہندی کے بیشتر محقیقن تفصیلات پر غور کیے بغیر اس منتر کا جاپ کرتے رہے ہیں۔اس سلسلے میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں ۔پہلی یہ کہ کوئی بھی تربیت یافتہ زبان کسی بھی عوامی بولی سے مکمل طور پر لسانی

مماثلت نہیں رکھتی ۔یہی صورتِ حال اردو اور کھڑی بولی کے باہمی رشتے کی ہے ۔دوسری یہ کہ کھڑی بولی کے ایک سے زیادہ رُوپ ہیں ۔کم از کم اس کی دوشکلوں کی نشان دہی گریرسن نے بھی کی ہے اورفرانسیسی عالم ژول بلوک نے بھی ۔اِس کا ایک رُوپ وہ ہے جو دوابہ گنگ و جمن کے بالائی حصّے یعنی سہارنپور، مظفر نگر اور میرٹھ (بشمول نوترا شیدہ ضلع غازی آباد) میں رائج ہے ۔ اور دوسرا وہ جو گنگا پار کے بجنور، رام پورا اور مراد آباد کے اضلاع میں بولا جاتا ہے ۔کھڑی بولی کی پہلی شکل یعنی بالائی دوآبہ کی بولی کو مشہور ہندی محقّق اور نقّاد ڈاکٹر رام بِلاس شرما ہریانوی ہی کا ایک رُوپ مان کرا سے " کُروجَن پَد کی بانگرو بھاشا " کہتے ہیں ۔ہندی کے بعض مصنفّین ا سے " کَورَوَی " کا نام دیتے ہیں ۔پروفیسر ژول بلوک نے بھی اُن لوگوں کے وطن کی نشان دہی جو شمال سے پہلے پہل اپنی زبان دکن لے گئے تھے "ضلع انبالہ اور شمالی دو آبہ" کے اضلاع کی ہے ، اس تصریح کے ساتھ :

"مغربی روہیل کھنڈ کے متعلق میں تحقیق سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ ان اضلاع کی اُردو نما زبان شاید بعد کے اثرات کی پیداوار ہے ۔"

مغربی روہیل کھنڈ سے مراد بجنور، مراد آباد اور رام پور کے اضلاع ہیں جہاں کی کھڑی، معیاری اُردو سے قریب ترین ہے ۔

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں اس کا کھڑی نام بہت زیادہ پُرانا نہیں ۔پریم ساگر کے مصنفّ للّو لال جی کو ی نے ۱۸۰۳ ء میں برج بھاشا سے امتیاز کرنے کے لئے ا سے استعمال کیا تھا ۔گریرسن نے " لسانیاتی جائزہ ہند " (جلد نہم حصّہ اوّل) میں اسی بولی کو " ورنا کلر ہندوستانی " کے نام سے یاد کیا ہے جس کی دو ادبی شکلیں ہیں : اردو اور ہندی ۔

کھڑی بولی کے ادبی نمونے اردو کی شکل میں اور اُردو رسمِ خط میں سب سے پہلے دکن میں ملتے ہیں ۔ فخردین نظامی بیدری کی تصنیف " مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" (۱۴۲۱ ء اور ۱۴۳۵ ء کے درمیان) اس کا پہلا مستند نقش ہے ۔ان نمونوں کی زبان پر تفصیلی محاکمہ ہم تیسرے باب میں کرچکے ہیں ۔

ہندی ادبیات میں للّو لال جی کی پریم ساگر سے قبل اس کا کوئی مربوط اورمسلسل نمونہ نہیں مِلتا، گواس کی بعض قواعدی خصوصیات کی نشاندہی اَپ بھرنشی ادبیات تک میں کی گئی ہے. ہندی ادب میں نامدیو (۱۳۱۸ تا ۱۴۰۸ ء کبیر داس (۱۴۴۰ تا ۱۵۱۵ ء) اورگرونانک (۱۴۶۹ تا ۱۵۳۹ ء) کی بانیوں میں اس کی پٹ مل جاتی ہے اور بس ۔

شمالی ہند میں بجز حضرت امیر خُسرو کی غیر مستند ہندی شاعری ، صوفیہ ، کرام کے ملفوظات میں جا بجا بکھرے ہوئے ہندی کے فقرے اور فارسی فرہنگوں میں ہندی نژاد الفاظ کے سوا محمد افضل افضلؔ (۱۶۲۵ ء) کی بکٹ کہانی (بارہ ماسہ) تک کوئی مسلسل اور وافر نمونہ نظم ونثر کا نہیں مِلتا ۔افضل کی بکٹ کہانی برج بھاشا کی

پٹ لئے ہوئے اس عہد کی اردو کی نمائندگی کرتی ہے جس میں ریختہ کا اسلوب بھی جابجا جھلک اٹھتا ہے۔

لسانی نقطۂ نظر سے سترھویں صدی کے اواخر(۱۶۸۸ء) کی سب سے اہم تصنیف روّشن کا " عاشورہ نامہ" ہے۔

یہ عاشورہ نامہ بہ ہندی زباں
کہوں کربلا کی لڑائی عیاں

مصنفّ کے قول کے مطابق یہ " بعضے مردماں " کے اصرار پر یہ " جنگ نامہ بہ ہندی زبان " عوامی ضرورت کے لئے کہا گیا ہے ۔اور یہ حقیقت بھی ہے کہ " عاشور نامہ ادبی لحاظ سے جس قدر ساقط الاعتبار ہے لسانی لحاظ سے اسی قدر اہم دستاویز ہے ۔" ایک لحاظ سے عاشور نامہ کی زبان دکنی اردو اور اٹھارویں صدی کی دوابہ کی زبان کی ایک کڑی ہے اور بہت سی مشترک لسانی خصوصیات کی حامل ہے۔کم از کم کھڑی بولی کی یہ سب سے قدیم اور اہم لسانی اور تاریخی دستاویز ہے جس کے مواد سے ہم " اُردو اور کھڑی " کے باہمی رِشتے کو اُجاگر کرنے میں مدد لی ہے ۔

اٹھارویں صدی کے نصف اوّل کی " زبانِ دہلی " کے سب سے مستند نمونے ہمیں میر جعفرز ٹلّی (م : ۱۷۱۴ء)کی کلیات ، شاہ مبارک آبروؔ کے دیوان (۲۷/ ۱۷۲۶ء) ، کلیات نواب صدر الدین فائز (۳۱ / ۱۷۳۰ء) اور شاہ حاتم کے قدیم دیوان (۳۲ / ۱۷۳۱ء) میں ملتے ہیں۔انھیں کے ساتھ ناجی ، یک رنگ اور مضمون وغیرہ کا کلام رکھنا ہوگا ہر چندان کے دوا دین سنینِ تصنیف کا صحیح علم ابھی تک نہیں ہوسکا ہے ۔

صوتی خصوصیات

کھڑی بولی کی صوتیات کئی لحاظ سے معیاری اردو کی صوتیات سے مختلف ہے۔

(۱) اِس لحاظ سے اس کی سب سے بڑی خصوصیت معکوسی ن (ण) کا کثرت سے استعمال ہے جو اردو نے اپنے ارتقا کی کسی منزل میں قبول نہیں کی اس اعتبار سے اردو برج کا تتبع کرتی ہے۔

(۲) دوسری خصوصیت کثرت سے مشدّد الفاظ کا استعمال ہے ۔اسی لئے بالائی دو آبے کے ضلعوں کو بعض اوقات " اضلاعِ مشدّدہ" کہا جاتا ہے ۔ان اضلاع میں رٹّی (روٹی) ، بدّل (بادل) ، چدّر (چادر) ، گُڈّی (گاری) وغیرہ عام ہے ۔روشن علی نے عاشور نامے (۱۶۸۸ء) میں کُلّ ، حُر ، جگّ بِلا تکلف باند ھے ہیں ۔معیاری اردو اس لحاظ سے بین بین ڈولتی ہے ۔ایک طرف اس میں مکّھن ، مچھّر، چکّی ملتے ہیں تو دوسری طرف روٹی ، بادل اور چادر پائے جاتے ہیں۔قدیم اردو یعنی دکنی اس لحاظ سے کھڑے بولی سے قریب ہے جس میں سُنّا (سونا)، چُلاّ (چولا) وغیرہ عام ہیں ۔

(۳)دکنی اُردو کی طرح کھڑی بولی کی یہ عام خصوصیت ہے کہ اس میں درمیانی (ہ) گرادی جاتی ہے اور نفسی آوازیں اپنی ہائیت کھودیتی ہیں۔عاشور نامہ میں نئیں (نہیں)، وو (وہ۔ دو کے ساتھ قافیہ ہے)،کاں (کہاں) ہر چند بعض اوقات، کہاں، بھی ملتا ہے۔

ع کہاں سیتی آئے گا کاں ہوئے گا (شعر ۱۹۳۸)

(۴) کھڑی میں قدیم اُردو کی طرح مصوتّوں کا انفیا نے رجحان عام ہے۔عاشورہ نامہ: فاطماں (فاطمہ)، کہناں (کہنا)، دیاں (دیا)، کونچ در کونچ (کوچ در کوچ)،

(۵) ساکن کو متحرک کردینے کا بھی رجحان ہے جو عوامی اردو کی تاحل خصوصیت ہے۔

عاشورنامہ: شَکل، رِحَم، نظَم، اَصِل (قافیہ دِل)

طِفَل، مِصَر، عَقَل، ذِکَر، شناخت وغیرہ۔

(٦) معیاری اردو کے برعکس کھڑی /ڑ/ اور /ڑھ/ پر /ڈ/ اور /ڈھ/ کو ترجیح دیتی ہے جو دکنی اُردو کی بھی خصوصیت ہے۔

اسماء

(۱) دکنی اردو میں جمع کی عام علامت (اں) ہے۔ہر چند نو سرہار جیسے مخطوطات میں (وں) اور (ن)کی جمعیں بھی مل جاتی ہیں۔(اں) کی جمع آج بھی میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع میں سُنائی دیتی ہے جیسے دناں، کھیتاں وغیرہ۔ لیکن عاشور نامے کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ سترھویں صدی کے اواخر تک (وں) کی جمع رائج ہوچکی تھی۔ روشن علی نے (اں) کی جمع کا استعمال صرف عربی فارسی الفاظ کے لئے کیا اور وہ بھی ہمیشہ نہیں۔ اس کے برعکس ولیؔ کے ریختوں کے زیرِ اثر متقدمین شعرائے دہلی (اں) کی جمع کا بھی استعمال تحریر میں کرتے رہے۔

ع دو بھواں تیغِ جنوبی سی دراز (فائز)

ع ناگنی سی تھیں لٹاں دو اس کے بر (فائز)

ع لب پہ گلوں کے مہر کرے ان لباں کا رنگ (حاتم)

جمع کا یہ قاعدہ جدید و قدیم ہریانوی کی عام خصوصیت ہے۔

(۲)، نے، کا استعمال دکنی اردو کی طرح کھڑی میں بھی بے قاعدہ طور پایا جاتا ہے یعنی یہ فاعلی اور مفعولی دونوں حالتوں میں آتا ہے۔مثلاً بندر نے اس نے دیکھ لیا (بندر نے اس کو دیکھ لیا)۔فاعلی حالت میں، نے، کو محذوف کردینے کا عمل دکنی اردو کی طرح فائز، آبرو، حاتم بلکہ سودا اور میر تک کے یہاں ملتا ہے۔

ع ایک دیکھی میں بھنگیڑن دل ربا (فائز)

ع گل کو محبوب مَیں قیاس کیا (میر)

'نے' کے باقاعدہ استعمال کی مثالیں نہ صرف متقدمین شعرائے اُردو کے یہاں بکثرت ہیں، روشن علی کے یہاں بھی ملتی ہیں

ع بہت سے دلا سا خلیفہ نے کی

اسمائے ضمیر

(۱) دکنی اُردو کا "یو" (ق۔ق) بعینہ آج بھی کھڑی کے علاقہ میں رائج ہے۔

(۲) دکنی اردو کا اُو(وہ) کھڑی میں اُوہ کی شکل میں رائج ہے۔

(۳) دکنی میں عام طور سے اضافی حالت میں "میرا" اور تیرا "کی بجائے "مُج" (ولی ا ص ا) مُنج (ق۔ق ص ۴) اور، تج، (ق،ق ص ۳) استعمال ہوتا ہے۔قدماء کے یہاں اس کی کثرت سے مثالیں مل جاتی ہیں جس سے ثابت ہے کہ یہ دکنی سے مخصوص نہیں۔مثلاً حاتمؔ کے یہاں "تم ساتھ" (انتخاب ص ۱۸) تجھ گلبدن کی بُو (انتخاب ص ۲۳) تجھ عشق (دیوان زادہ ص ۳۵۹) مجھ ساتھ، مجھ پاس (فائز ص ۱۷۸) ہمن پاس (فائز ایضاً) موجودہ اردو اور دہلی کی بولیوں میں یہ اب متروک ہے۔

(۴) جمع متکلم اور حاضر کی مفعولی حالت میں "ہمنا" اور "ہمن کو" اور "تُمنا" "تُمن کو" کی شکلیں ملتی ہیں۔ حاتم کے یہاں اس کی مثال نہیں ملتی ۔نواحِ دہلی کی بولیوں میں صرف برج بھاشا میں یہ شکلیں پائی جاتی ہیں ۔ حضرت کمال الدین مخدوم شیخ سعدی کا کوروی (۱۵۶۳ء) نے ضمائر کی یہ شکلیں اپنے ایک شعر میں استعمال کی ہیں ۔

ہمنا تمن کو دل دیا، تم دل لیا اور دُکھ دیا

ہم یہ کیا، تم وہ کیا، ایسی بھلی پیت ہے

(۵) ہمن "ہمیں" اور، ہمیں کو، کی دکنی شکلیں بھی قدیم اردو میں رائج تھیں۔مثلاً پنڈت چندر بھان برہمن ۱۶۶۲ء کے اس مصرع میں

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے

افضل کا بھی ایک مصرع ہے.. ع

سنی دل سوں کبھی دیکھی ہمن کوں

(۶) دکنی کے ضمائر میں سب سے قابلِ ذکر "اپس" ہے جو قلی قطب شاہ (ص ۴) سے لے کر ولی

(کلیات ص ۲) یکساں طور پر خود کے معنوں میں مستعمل پایا جاتا ہے۔اس کا تعلق بھی نواحِ دہلی کی بولی سے ہے۔افضل کے بارہ ماسہ کا یہ شعر دیکھئے ؎

اری سبزک پیا کے باغ جاکر　　　اَپس کوں بے وفا سیتی لوکا کر

افعال:

دکنی اردو کے بیشتر افعال کی توجیہہ ہریانوی کے قواعد سے کی جاچکی ہے۔ہریانوی سے پنجابی اور راجستھانی افعال کی کچھ مخصوص شکلوں کو نکال دینے کے بعد اس میں اور کھڑی کے افعال میں بالکل فرق نہیں رہتا۔ادبی اُردو میں افعال کی بیشتر شکلیں (مثلاً جائے ہے، کھائے ہے، ماروں ہو، آوے، لاوے.. کیجیو۔ دیجیو۔ ہووے گا (انتخاب حاتم ص ۲۱)بناؤنا (بمعنی بنانا قلمی نسخہ دیوان زادہ ص ۲۳۷) لے لیویں۔ دیویں، راکھو (فائز ص ۲۰۷) لیؤ، دیوؤ، ہیگا (عاشورنامہ) ع فرشتہ تھا ایک پروں پر سوار (شعر ۱۳۷) جو آج فصاحت کے مرتبہ سے گرگئی ہیں، نواحِ دہلی اور دہلی میں بلا تکلف استعمال کی جاتی ہیں۔ دکنی ادبیات میں یہ ہر صفحہ پر مل جائیں گی ۔کہلاوے (س۔ر۔ص ۲۲) جیوے گا (س۔ ر۔س ۳۷) سہاوے (س ۔ر۔ص ۳۷) اتھا اور اتھی کی شکلیں عاشورنامے میں شاذ مل جاتی ہیں۔ قدماء کے یہاں نہیں مِلتیں۔

حروف:

دکنی زبان کے تقریباً تمام حروف نواحِ دہلی کی بولیوں میں قدیم زمانے سے رائج ہیں ۔ دکنی کے عام مستعمل حروف ربط حسب ذیل ہیں:

کا۔کی ۔ کے ۔کوں (ق۔ق۔ص ۲۳۲) سیتی (ق۔ق۔ص ۲۳۵) سیتے (ق۔ق۔ص ۸۷) تے (ق۔ق۔ص ۸۷) (س۔ر۔ص ۱۸) سوں (ق۔ق۔ص ۲۳۶) تھے (ق۔ق۔ص ۲۳۲) ستیں (ق۔ق۔ص ۲۳۴) (ق۔ق۔ص ۲۳۶) میں (و۔لی۔ص ۲) منے (ق۔ق۔ص ۲۲۵) میں (ق۔ق۔ص ۲۳۲) لگوں (ق۔ق۔ص ۵۱) لگ (و۔لی۔ ص ۱۸) لگن (س۔ر۔ص ۱) میں (کلیاتِ و۔لی۔ص ۵) پہ (ق۔ق۔ص ۲۳۶) پو (س۔ر۔ص ۱۵) تئیں۔

ان میں سے کوں۔ سوں۔ سی۔ منے۔ لگ ۔ اور یہ دکنی میں عام مستعمل تھے اور قلی قطب، وجہی اور ولی سب کے یہاں ملتے ہیں۔" تھے " قلی قطب سے مخصوص ہے۔لگن اور پو وجہی سے۔شمالی ہند میں " سیتی " اور " ستی " روشن عالی، فائزؔ، ابروؔ، حاتمؔ اور دیگر متقدمین کے یہاں بار بار آیا ہے۔

روشن علی　　ع　　جورو ہاتھ سیتی جو اس کے گئی

فائز　　ع　　اَدھر اس کے یاقوت سیتی ہیں بیش

"　　ع　　عقیقِ یمن لب ستی منفعل

آبرو ع شعر کو مضمون ستی جو قدر ہی ہے آبروؔ

ع حکمت کی تیغ سیتی کاٹور قیب کا سر

حاتمؔ دل میں طمع نہیں مجھے شاہ و گدا ستے

میں سب کو چھوڑ ساز کیا ہوں خدا ستے

" لگ " سب قدماء کے یہاں پایا جاتا ہے ۔ کوں ۔ سیں میں انفی آواز آج تک نواح دہلی کی بولیوں کی خصوصیت ہے۔ قدیم اردو میں کوں (ص ۸۸ پنجاب میں اردو) افضلؔ، فائزؔ، آبروؔ سب کے یہاں ملتا ہے وہ " سے "کو" سیں " اور" نے "کو" نیں " بھی لکھتے ہیں۔ پہ ۔ کا۔ کی ۔ کے۔ نے اور تئیں اردو کے عام مستعمل حرف ربط ہیں ۔ دکن کے دیگر عام مستعمل حروف حسبِ ذیل ہیں۔

سو۔ جو۔ تو۔ ہور۔ و۔ چ (ہی کے معنوں میں تاکید کے لئے) ان میں " چ" تاکید کو چھڑ کر (جیسے آپیچ، یونہچ، نہیچ بمعنی آپ ہی، یوں ہی، نہیں ہی ۔ باقی تمام حروف نواحِ دہلی میں قدیم زمانے میں انھیں معنوں میں رائج تھے۔" ہور" " ہور" " آر" اور" ہر" کی شکل میں سہارن پور، میرٹھ اور ضلع دہلی میں آج بھی سُنائی دیتا ہے ۔

" چ " تاکیدی البتّہ مرہٹی زبان سے لی گئی ہے اس کی مثال شمالی ہند کی بولیوں میں نہیں ملتی۔ یہ مرہٹی سے مخصوص ہے ۔ یہ سنسکرت کے " چ، ایوا" سے ماخوذ ہے ۔ا سے میں دکنی مخطوطات کا ، نکو، کے ساتھ کلیدی لفظ سمجھتا ہوں۔

قدیم دکنی کے اکثر غریب الفاظ کی توجیہہ نواح دہلی کی بولیوں سے کی جاسکتی ہے۔

(۱) دِھر یا دِھیر (فرہنگ قطب مشتری) بمعنی سمت اور طرف کے استعمال ہوا ہے۔میرٹھ کی نواح کی بولی میں دھورے اب تک سمت کے معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔(دیکھئے میرٹھ کی زبان کا نمونہ : گریرسن، جلد نہم)

(۲) کدھیں (ف۔ ق۔ م) کبھی کے معنوں میں اب تک دہلی اور اس کے اطراف میں مستعمل ہے۔قدماء کے یہاں مسلسل ملتا ہے۔

(۳) اتاول (فـ ق م) قدیم دکنی میں " جلد " کے معنوں میں آتا ہے۔دہلی کا محاورہ ہے قدماء کے یہاں انھیں معنوں میں ملتا ۔ اتاؤلا باؤلا (جلد باز پاگل ہوتا ہے)

(۴) اَپی ف۔ ق۔ م) آپ ہی کے معنوں میں پانی پت اور کرنال میں سُنائی دیتا ہے۔

(۵) اِتّا۔ جتّا (ف۔ ق۔ م) جہلا میں عام مستعمل ہے ۔

(٦) فکروند (ف۔ ق۔ م) فکر مند : ہریانی میں عام طور سے " م " (و) میں تبدیل ہوجاتا ہے۔جیسے دہلی میں چلمن کو چِلون عام طور سے کہتے ہیں۔

(۷) وستاد ۔وصول (فـ قہ م) بمعنی استاد اور اصول قدیم دکنی میں ملتے ہیں ۔دہلی اور میرٹھ کی بولی میں یہ عام ہےجہاں استاد کو، وستادِ اور ،اِن، کو ، وِن، بولا جاتا ہے۔

(۸) اچھنا (سب رس) بمعٰنی ہونا عام طور سے دکنی میں مِلتا ہے ۔دہلی کے مضافات کی جو قدیم بولی دکن سے لی جائی گئی ہے اس میں فعل " اچھنا ہے اور " اہے " کے ساتھ ساتھ مستعمل تھا " اچھنا " قدیم وجدید راجستھانی اور گجراتی میں ملتا ہے اور یہ اَپْ بھرنش کا عام مستعمل لفظ تھا جو اکثر بولیوں میں اب متروک ہوگیا ہے۔

(۹) دیسنا: بمعنی دکھائی دینا، دکنی کا عام مستعمل فعل ہے ۔شمالی ہند کی قدیم اُردو میں بھی یہ بہ کثرت ملتا ہے۔

(۱۰) اُپجنا: بمعنی اُگنا۔پیدا ہونا ۔خالص سنسکرت کا لفظ ہے جو دکنی میں مِلتا ہے لیکن اردو میں عرصہ سے متروک ہے۔ دہلی کا ایک محاورہ ہے بو یا گیہوں اُپجا جَو (بھلائی کے بدلے بُرائی)

(۱۱) پَتیا نا: یقین کرنے کے معنوں میں قدیم دکنی میں ملتا ہے لیکن اردو میں اب متروک ہے .لیکن دہلی کے دو محاورے سُنئے ۔(۱) اندھا جب پتیا ئے (یقین کرلے) جب دو آنکھیں پا ئے ۔(۲) بامن جیمے ہی پتیا ئیں (جب مطلب ہوجائے تو یقین کرنا)

(۱۲) سیونا: بمعنی پرورش کرنا۔خدمت کرنا۔دکنی میں مستعمل ہے۔دہلی کا محاورہ ہے۔

انڈے سیوے فاختہ کوّے میوئے کھائیں

(۱۳) گھالنا: قدیم دکنی کا عام مستعمل فعل ہے ۔اس کی شکل دہلی کے ایک محاورہ میں دیکھئے۔ایک گھر گھالو آپنا دوسرے آس پڑوس (دوسروں کو ساتھ لے ڈوبنے کے معنوں میں)

(۱۴) رُچ: خوشی کے معنوں میں سب رس اور قطب مشتری یں اکثر ملتا ہے۔دہلی کا ایک محاورہ ہے۔ ایک گھربچے تو سب گھررُ چے (خاندان کے ایک کا خوش ہونا سب کا خوش حال ہونا ہے)۔

(۱۵) ناؤں اور ٹھاؤں: (نام اور جگہ) قدیم دکنی اور اُردو میں عام مستعمل تھے ۔دہلی کے دو محاوروں میں یہ جوں کے توں ملتے ہیں۔

۱۔ پھٹے میں پاؤں، دفتر میں ناؤں (دخل در معقولات دینا)

۲۔ ثابت قدم کو ہر جگہ ٹھاؤں۔

(۱۶) فارسی افعال پر اردو کا ٹھپّہ لگادینے کا رُجحان دکنی میں عام ہے ۔مثلاً خرچ سے خرچنا۔شمالی ہند میں یہ اب کم بولا جاتا ہے۔دہلی کا پُرانا محاورہ ہے۔

جو گدھا جیتیں سنگرام　　　　توکا ہے کو خر چے دام

(ادنیٰ سے نکلے کام تو اعلیٰ کو کون پوچھے)

(۱۷) کہوانا۔ کاڑنا (نکالنا) آج بھی دہلی اور اس کے مضافات میں رائج ہے۔

ہمارے خیال میں مراہٹی زبان کے بعض لسانی اثرات کو چھوڑ کر دکنی اُردو کے تمام غریب الفاظ کی توجیہ نواحِ دہلی کی تین بولیوں (ہریانی، کھڑی اور برج) سے کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ شمالی ہند میں زبان کے ارتقا کی رفتار بہت تیز رہی ہے۔ اس کے برخلاف دکن میں اجنبی بولیوں کے ماحول میں لسانی ارتقا بالکل رُک سا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی اردو میں الفاظ کی وہی شکلیں ملتی ہیں جو شمالی ہند میں آج سے چھ سو برس پہلے رائج تھیں ماحول یا جواب صرف گھریلو اور دیہاتی زبان میں پائی جاتی ہیں۔ جدید آریائی زبانوں کی تحقیق کے سلسلے میں محقیقن کی ایک عام غلطی یہ بھی رہی ہے کہ انھوں نے بعض بولیوں کو بعض علاقوں سے مخصوص کردیا ہے۔ اس قسم کے لسانی مغالطوں کا پول ہم شروع سے کھولتے آئے ہیں۔ جیسا کہ نئی تحقیق سے اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ مہاراشٹری پراکرت کا مہاراشٹر دیس سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ شورسینی کی ایک ترقی یافتہ شکل تھی۔ دراصل ہندوستان میں زبانیں قبیلوں، سماج کے مختلف طبقات اور پیشہ وروں کی جماعتوں سے مخصوص رہی ہیں۔ ہرزمانہ میں دہلوی سماج کے مختلف طبقات میں مختلف بولیاں رائج رہی ہیں۔ ہمارا پہلا ماہرلسانیات اور لغت نگار خان آرزو جب " نوادرِ الالفاظ " میں اہلِ اُردو کا معیار متعین کرتا ہے تو اُسے حسب ذیل زبانوں کے گورکھ دھندے پر نظر رکھنی پڑتی ہے ہندی کتاب (سنسکرت) گوالیاری (برج) ہندی راجپوتی (راجستھانی) (ہندی کشمیری)، ہندی پنجاب (پنجابی) زبان مردم پنجاب، زبان اردو، زبان اکبر آباد (آگرہ) و شاہجہاں آباد (دلّی) اصطلاح شاہجہاں آباد و اہلِ اردو، ہندی فصحاء۔

تاریخی تحقیق سے جوں جوں مختلف علاقوں کی آبادیوں کی نقل و حرکت پر روشنی پڑے گی لسانی گتھیاں خود بخود حل ہوتی چلی جائیں گی۔ جس طرح دو آبہ کے مختلف راجپوت گھرانوں میں راجستھانی گیت رائج ہیں۔ ممکن ہے کہ دکن میں بھی شمالی ہند کی ایک بولی نہ گئی بلکہ کئی بولیاں پہنچی ہوں جن کی آمیزش سے بعد کو محمد قلی قطب شاہ، وجہی اور عبدل کی معیاری دکنی متشکل ہوتی ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ یہ تمام بولیاں " دہلی و پیرامنش "(خسروؔ) ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اِس لئے اُردو کی ابتدا پر مزید کام کرنے کے لئے نواحِ دہلی ہی کی بولیوں کی جدید و قدیم شکلوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے، جن سے عام طور پر دکن کے محقیقین ناواقف ہیں۔ اس راہ میں یہ سنگِ گراں حائل ہے کہ دہلی کے نواح کی دوبولیوں ہریانی، کھڑی کے قدیم نمونے ناپید ہیں اور شاید اسی بناء پر محمود شیرانی اور ان کے تتبع میں ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کھڑی بولی اور ہریانی کو فتح دہلی کے بعد کا ارتقا مانتے ہیں، اور اس طرح چندر شرما گلیری کے اس قیاس کی تائید کرتے ہیں کہ " بدیسی مسلمانوں نے آگرہ،

دہلی ، سہارنپور ، میرٹھ کی پڑی بولی کو کھڑی بناکر اپنے لشکر اور سماج کے مطابق بنالیا "۔ لیکن یہ قیاس ہند آریائی زبان کے اس تحقیقی مواد کا بطلان کرتا ہے جو شورسینی پراکرت اور اَپ بھرنش کے بارے میں جمع ہوچکا ہے اور جس کی رُو سے پنجابی کے ارتقاء پر مدھیہ دیش کی زبان کی گہری چھاپ ہے ۔پروفیسر شیرانی کی نظر اس لسانی مواد پر نہیں رہی ہے ۔ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ بھی اس مواد سے بے خبر تھے ۔

اردو کی ابتدا کے سلسلے میں تحقیق کی جو سمت اس تصنیف میں مقرر کی گئی ہے تمام تر نئے مواد سے اس کی تصدیق ہوتی ہے ۔ نواحِ دہلی کی بولیوں کے قدیم نمونے جوں جوں روشنی میں آتے جائیں گے یہ بات بھی واضح ہوتی جائے گی کہ اردو کا ماخذ یہی بولیاں ہیں ۔دکن میں یہ بولیاں " زبانِ دہلی " کی ایک ایسی شکل میں پہنچتی ہیں جب وہ سیال تھی اور اس پر مختلف لسانی اثرات کار فرما تھے ۔شمالی ہند میں اردو ارتقا کا عمل متقدمین شعرائے دہلی بلکہ دبستانِ لکھنؤ تک جاری رہا۔ جب کہ دکن میں قلی قطب شاہ اور وجہی کی ادبی زبانوں میں اس کا رُوپ متعین ہوجاتا ہے ۔

اِس لیے زبانِ دھلی و پیرامنش " اردو
کا اصل منبع اورسرچشمہ ھے اور
"حضرتِ دلی " اُس کا حقیقی مولد و
منشاء ۔

○○○